ماہنامہ

اشراق

لاہور

جنوری ۲۰۱۰

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

''اسلامی شریعت تسکین شہوت کے لیے بیویوں کے سوا کسی کے ساتھ کوئی تعلق قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اللہ تعالیٰ نے اِسے حرام قرار دیا ہے اور سورۂ مومنون میں پوری وضاحت کے ساتھ بتا دیا ہے کہ قضاے شہوت کے لیے جو لوگ اِن کے ماسوا کسی سے تعلق قائم کریں گے، وہ خدا کے حدود سے تجاوز کے مجرم ہوں گے''۔

—— شذرات

المورد

دارالاشراق

شذرات

حفظ فروج	جاوید احمد غامدی	۲

قرآنیات

المائدہ (۲۰)	جاوید احمد غامدی	۵

معارف نبوی

حب علی	طالب محسن	۹
اخلاقیات (صراط مستقیم)	محمد رفیع مفتی	۱۳

سیر و سوانح

حضرت عبدالرحمان بن عوف	وسیم اختر مفتی	۱۹

نقد و نظر

مولانا مفتی عبدالواحد کی تنقیدات کا ایک جائزہ (۲)	محمد عمار خان ناصر	۳۳

اصلاح و دعوت

ہم کو نہیں	ریحان احمد یوسفی	۵۵

یسئلون

متفرق سوالات	محمد رفیع مفتی	۵۹

جاوید احمد غامدی

حفظ فروج

اسلامی شریعت تسکین شہوت کے لیے بیویوں کے سوا کسی کے ساتھ کوئی تعلق قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اللہ تعالیٰ نے اِسے حرام قرار دیا ہے اور سورۂ مومنون میں پوری وضاحت کے ساتھ بتا دیا ہے کہ قضاے شہوت کے لیے جو لوگ اِن کے ماسوا کسی سے تعلق قائم کریں گے، وہ خدا کے حدود سے تجاوز کے مجرم ہوں گے۔ زمانۂ رسالت کی جن لونڈیوں کے لیے اُس وقت تک آزادی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی، وہ، البتہ اِس حکم سے مستثنیٰ تھیں اور لوگ چاہتے تو اُن کے ساتھ بھی یہ تعلق قائم کر سکتے تھے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ، فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ، فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ. (المومنون ۲۳: ۵-۷)

’’اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے سوا، اِس لیے کہ اُن کے معاملے میں اُن پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ ہاں، جو اِن کے علاوہ کچھ چاہیں تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔‘‘

آیت کا مدعا یہی ہے، مگر اِس سے بعض فقہا نے یہ استدلال بھی کیا ہے کہ اِس میں بیویوں اور مملوکہ عورتوں کے سوا قضاے شہوت کے تمام طریقے حرام قرار دیے گئے ہیں، لہٰذا زنا، عمل قوم لوط اور وطی بہائم کی طرح جلق ’masturbation‘ کی مختلف صورتیں بھی قطعاً حرام ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو رعایت اِس معاملے میں دی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ اِن کی حرمت زنا اور عمل قوم لوط اور وطی بہائم کی بہ نسبت کم تر سمجھی جائے اور اِن گناہوں سے بچنے کے لیے لوگ اگر اِس طریقے سے اپنے جوش طبع کی تسکین کر لیں تو اُن کے حق میں توقع رکھی جائے کہ شاید اللہ تعالیٰ اُنھیں سزا نہ دے۔

ہمارے نزدیک یہ استدلال عربیت کی رو سے نہایت کمزور، بلکہ غلط ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ آیت میں 'عَلٰی' 'حٰفِظُوْنَ' کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا، اِس لیے یہاں لازماً تضمین ہے اور 'حٰفِظُوْنَ' کے بعد 'عن الوقوع علٰی احد' یا اِس کے ہم معنی الفاظ حذف کر دیے گئے ہیں۔ چنانچہ مستثنٰی منہ استمنا کے طریقے نہیں، بلکہ افراد ہیں جن سے کوئی شخص جنسی تعلق قائم کر سکتا ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ آیت کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ بیویوں اور مملوکہ عورتوں کے سوا قضاے شہوت کا کوئی طریقہ اختیار کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ یہ ہوں گے کہ بیویوں اور مملوکہ عورتوں کے سوا کسی سے قضاے شہوت کرنا جائز نہیں ہے۔ آیت کی صحیح تاویل یہ ہے، لہٰذا پورے اطمینان کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں کوئی نص صریح یا قاعدۂ کلیہ ایسا نہیں ہے جس کے تحت استمنا بالید کو حرام یا مکروہ ٹھیرایا جائے۔ یہی صورت حدیث کی ہے۔ اِس کے ذخائر بھی اِس کے متعلق کسی ایسی روایت سے خالی ہیں جو محدثین کے نزدیک قابل قبول ہو۔ چنانچہ اِس معاملے میں صحیح مسلک وہی ہے جو امام ابن حزم نے اپنی کتاب ''المحلیٰ'' (۲۲۱/۱۳) میں پورے دلائل کے ساتھ پیش فرمایا ہے، پھر سند کے ساتھ بتایا ہے کہ حسن بصری، عمرو بن دینار، زیاد ابو العلا اور مجاہد جیسے بزرگ بھی استمنا بالید کی اباحت کے قائل تھے جو اِس طرح کی چیزیں بالعموم صحابۂ کرام ہی سے روایت کرتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ المائدہ

(۲۰)

(گذشتہ سے پیوستہ)

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَلَکُمْ تَسُؤْکُمْ، وَاِنْ تَسْئَلُوْا
عَنْھَا حِیْنَ یُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَلَکُمْ، عَفَا اللّٰہُ عَنْھَا، وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ﴿۱۰۱﴾ قَدْ سَاَلَھَا

۴۔ایمان والو،[۲۱۵] ایسی باتیں نہ پوچھا کرو جو اگر ظاہر کر دی جائیں تو تم پر گراں ہوں، اور ایسے وقت میں کہ قرآن نازل ہو رہا ہے، تم اُنھیں پوچھو گے تو وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔ (اِس وقت تو) یہ چیزیں اللہ نے معاف کر دی ہیں اور اللہ بخشنے والا ہے، وہ بڑا بردبار ہے۔ تم سے پہلے ایک قوم[۲۱۶] نے

۲۱۵؎ یہ چوتھے سوال کا جواب ہے جس کی ابتدا ایک برسر موقع تنبیہ سے ہوئی ہے۔ فرمایا ہے کہ لوگ غیر ضروری سوالوں سے اجتناب کریں۔ اِس تنبیہ کی ضرورت اِس لیے محسوس ہوئی کہ اِس طرح کے سوالات حکم کے حدود و قیود بڑھا دیتے ہیں، پھر لوگ اُنھیں نباہ نہیں پاتے اور اِس کے نتیجے میں اللہ کے غضب کو دعوت دے بیٹھتے ہیں۔ اللہ چاہتا ہے کہ جو حکم جس طرح دیا گیا ہے، اُس پر اُسی طرح عمل کیا جائے، ہر مجمل کی تفصیل اور ہر مطلق کی تعیین و تقیید سے اپنے لیے مشکلات نہ پیدا کی جائیں۔ پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ خدا کی آخری شریعت قیامت تک کے لیے ہے، اِس میں فقہ و اجتہاد کی وسعتیں محدود نہیں ہو سکتیں۔ غیر ضروری سوالوں سے اندیشہ ہے کہ یہ محدود ہو جائیں گی اور آنے والی نسلوں کے لیے مشکلات کا باعث ہوں گی۔

قَوۡمٌ مِّنۡ قَبۡلِكُمۡ، ثُمَّ اَصۡبَحُوۡا بِهَا كٰفِرِيۡنَ ﴿۱۰۲﴾ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنۡ بَحِيۡرَةٍ وَّلَا
سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيۡلَةٍ وَّلَا حَامٍ، وَّلٰكِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ
وَاَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۰۳﴾ وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ: تَعَالَوۡا اِلٰى مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى
الرَّسُوۡلِ، قَالُوۡا: حَسۡبُنَا مَا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا، اَوَلَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ

اِسی طرح کی باتیں[۲۱۷] پوچھیں، پھر اُنھی کے منکر ہو کر رہ گئے تھے۔ (تمھارے سوال کا جواب یہ ہے کہ) اللہ نے نہ کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے، نہ سائبہ، نہ وصیلہ، نہ حام[۲۱۸]، مگر یہ منکرین اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور ان میں زیادہ وہ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ اور جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ اتارا ہے، اُس کی طرف آؤ اور (اللہ کے) رسول کی طرف آؤ تو کہتے ہیں کہ ہمارے لیے وہی کافی ہے جس

۲۱۶ یہ حوالہ بطور مثال ہے اور قوم سے مراد یہود ہیں۔ اُن کا ذکر نکرہ کے ساتھ کیا ہے جس سے فی الجملہ نفرت اور اعراض کا اظہار ہوتا ہے۔ اُن کے سوالوں کی ایک مثال گائے کا قصہ ہے جو سورۂ بقرہ (۲) کی آیات ۶۷-۷۱ میں بیان ہوا ہے۔

۲۱۷ اصل میں 'قَدْ سَاَلَهَا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ضمیر بیانِ نوعیت کے لیے ہے۔ قرآن کے نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں ضمیریں اِس طرح بھی آتی ہیں۔

۲۱۸ اِس جملے میں فعل 'جَعَلَ' استعمال ہوا ہے۔ ہم نے اِس کا ترجمہ 'مقرر کرنے' کے الفاظ سے کیا ہے۔ اِس سے مراد یہاں مشروع کرنا ہے، یعنی 'بحیرۃ'، 'سائبۃ'، 'وصیلۃ' اور 'حام' کے نام سے بعض جانوروں کے لیے جو ممنوعات مشرکین نے قائم کر رکھے ہیں، اُنھیں اللہ نے مشروع نہیں فرمایا ہے۔

'بحیرۃ' اُس اونٹنی کو کہتے تھے جس سے پانچ بچے پیدا ہو چکے ہوتے اور اُن میں آخری نر ہوتا۔ اِس اونٹنی کے کان چیر کر اُسے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔

'سائبۃ' اُس اونٹنی کو کہتے تھے جسے کسی منت کے پورا ہو جانے کے بعد آزاد چھوڑ دیتے تھے۔

'وصیلۃ'، بعض لوگ نذر مانتے تھے کہ بکری اگر نر جنے گی تو اُسے بتوں کے حضور پیش کریں گے اور اگر مادہ جنے گی تو اپنے پاس رکھیں گے۔ پھر اگر وہ نر و مادہ، دونوں ایک ساتھ جنتی تو اُس کو وصیلہ کہتے اور ایسے نر کو بتوں کی نذر نہیں کرتے تھے۔

شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴿۱۰۴﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا، عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ، اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا، فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴿۱۰۵﴾

پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا اُس صورت میں بھی جب کہ اُن کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور نہ راہ ہدایت پر رہے ہوں؟ ایمان والو، تم اپنی فکر کرو، تم راہ ہدایت پر ہو تو کسی دوسرے کی گمراہی تمھارا کچھ نہیں بگاڑے گی۔ تم سب کو اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے، پھر وہ تمھیں بتا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔[۲۱۹] ۱۰۱-۱۰۵

'حام' اُس سانڈ کو کہتے تھے جس کی صلب سے کئی پشتیں پیدا ہو چکی ہوتیں، اُسے بھی آزاد چھوڑ دیتے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہ سب عرب جاہلیت کی نذریں اور منتیں تھیں۔ اِس قسم کے جانور آزاد چھوٹے پھرتے، جس گھاٹ سے چاہتے، پانی پیتے اور جس کی چراگاہ میں چاہتے، پھرتے۔ نہ اُن کو کوئی روک سکتا نہ چھیڑ سکتا۔ اُن کو مذہبی تقدس کا ایسا درجہ حاصل تھا کہ ہر شخص اُن کے چھیڑنے کے وبال سے لرزہ براندام رہتا۔ قرآن نے واضح فرما دیا کہ اُن کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ شرعی حیثیت صرف ہدی اور قلائد کی ہے۔ یہ چیزیں صرف اوہام کی ایجاد ہیں جن کو شریعت کی طرف منسوب کرنا اللہ اور اُس کی شریعت پر صریح اتہام ہے۔ جو لوگ عقل سے عاری ہیں اُنھوں نے اِن احمقانہ چیزوں کو اللہ سے نسبت دے رکھی ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۶۰۲)

۲۱۹؎ اوپر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی تھی کہ رسول کی حیثیت سے آپ کی ذمہ داری صرف حق پہنچا دینے کی ہے۔ یہ اُسی طرح اب مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ تمھاری ذمہ داری بھی اِس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ نہیں سنبھلتے تو اِس میں تمھارا کوئی قصور نہیں ہے، بلکہ اِن کے مزاج کا فساد ہے جو حقائق کی تکذیب کا باعث بن رہا ہے۔ تم نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی تو اِن کے بارے میں پھر تم سے کوئی پرسش نہیں ہونی ہے۔

[باقی]

طالب محسن

حب علی

قَالَ عَلِیٌّ (رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ) وَالَّذِیْ فَلَقَ الْحَبَّۃَ وَبَرَأَ النَّسَمَۃَ إِنَّہُ لَعَہْدُ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ إِلَیَّ أنْ لَّا یُحِبَّنِیْ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا یُبْغِضَنِیْ إِلَّا مُنَافِقٌ.

حضرت علی (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ اس ذات کی قسم جس نے بیج کو پھاڑا اور روح کو تخلیق کیا کہ نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کا میرے ساتھ عہد تھا کہ مجھ سے مومن ہی محبت کرے گا اور منافق ہی میری دشمنی کرے گا۔

لغوی مباحث

'النَّسَمَۃَ': کا لفظ فرد انسان کے لیے بھی آتا ہے، روح کے لیے بھی آتا ہے اور نفس کے مترادف کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں روح یا نفس ہی کے معنی میں آیا ہے۔

'اَلْعَہْدُ': عہد کا لفظ میثاق کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں محل خبر کا ہے۔ غالباً حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک یقینی نتیجے کی خبر دی تھی کہ تم سے دشمنی ایمان کی قیمت پر ہو گی اور تم سے محبت ایمان کی وجہ سے ہو گی۔

معنی

مضمون کے اعتبار سے دیکھیں تو اس روایت اور پچھلی روایت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس اصول پر انصار کی محبت کے دین وایمان سے تعلق کی وہاں وضاحت ہو جاتی ہے، اسی اصول پر یہاں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دینی خدمات اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت کا رشتہ، دونوں اپنی اپنی جگہ پر اہمیت کے حامل ہیں۔ پہلی چیز تمام صحابہ میں مشترک ہے۔ وہ دین کو قبول کرنے کے بعد جس طرح دین کے ساتھ وابستگی کے معیارات پر پورے اترے، یہ انھی کا حصہ ہے۔ باقی امت ان کے اس مقام ومرتبے کی قدر شناس اور ان کی دینی خدمات اور دین کے فروغ وابلاغ میں بنیادی کردار رکھنے کی وجہ سے ان کی تہ دل سے احسان مند ہے۔ یہ اور صحابہ کی عظمت کے بعض دوسرے پہلو ہیں جو امت کے دل میں ان کے لیے عقیدت اور محبت کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ یہ جذبات اس اعتبار سے دین اور ایمان ہی کا اظہار ہیں کہ یہ خود ہماری دین سے وابستگی کا فطری مظہر ہیں۔ اگر کوئی شخص دین سے وابستگی رکھتا ہو، لیکن اس کو اہل دین سے کوئی عقیدت نہ ہو، یہ بات ناقابل فہم ہے۔ ایسا صرف ایک ہی صورت میں ممکن ہے کہ اس انسان نے ایک مشین کی صورت اختیار کر لی ہے اور وہ انسان ہونے کی بنیادی خصوصیت ہی سے عاری ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دوسری حیثیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کی ہے۔ جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے، وہ آپ کے قرابت مندوں سے بھی محبت اور عقیدت رکھتا ہے۔ چنانچہ پوری امت حضور کی ازواج اور آپ کے دامادوں ـــــ حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما ـــــ سے بھی پوری محبت اور عقیدت رکھتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اہل خاندان حضور سے محبت رکھتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے محبت رکھتے تھے۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جن کی اسلام کے لیے غیر معمولی خدمات ہیں۔ جس نے ان حقائق کا ادراک کیا اور ان کے ساتھ محبت اور عقیدت رکھی، یہ اس کے صدق ایمان اور اسلام کے ساتھ سچی وابستگی کا ثبوت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کا رویہ اس کے مخالف ہے، بجا طور پر اس کی دین سے وابستگی محل نظر ٹھہرتی ہے۔

یہاں دو سوالات پیدا ہوتے ہیں: ایک سوال یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی میں جو سیاسی معاملات پیش آئے اور اس میں لوگوں نے ان سے اختلاف کیا، ان کی کیا حیثیت ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اس روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر امتیازی طور پر کیوں ہوا ہے؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہاں وہ دشمنی اور بغض زیر بحث ہے جس کا محرک دین کی دشمنی ہے۔ ظاہر ہے، جو

شخص دین کا دشمن ہے، وہ اہل دین کا بھی دشمن ہے۔ اسی طرح جو شخص دین سے وابستہ ہے اور اس کی حمیت وحمایت پر کمر بستہ ہے، وہ اہل دین کے ساتھ بھی عقیدت اور محبت رکھتا ہے۔ باقی رہے صحابہ کے دیگر امور میں فیصلے اور اقدامات تو ان میں صحابہ کا باہم مختلف ہونا یہاں زیر بحث نہیں ہے۔ اسی طرح امت کے اکابر علما ان واقعات کے حوالے سے اپنے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرتے رہے ہیں، وہ بھی اپنا ایک محل رکھتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں اس روایت میں موجود وعید کا ہدف نہیں ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خصوصی ذکر اور اس میں عہد کا لفظ اس روایت کو بعد کے مناقشات کے تناظر سے متعلق کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اسی قبیل سے ہے جس میں آپ نے مختلف مواقع پر مختلف صحابہ کے ساتھ اپنے تعلق کا اظہار کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چونکہ بعد میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے، اس وجہ سے یہ روایت اپنے اصل محل کے بجائے خصوصی سیاق وسباق سے متعلق دکھائی دینے لگتی ہے۔ ہمارے نزدیک، اس طرح کے بیانات کی وجہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اظہار محبت ہے اور ہمارے لیے ان کی قدر و قیمت یہ ہے کہ جن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم محبت رکھتے تھے، ان کے ساتھ ہم بھی عقیدت رکھتے ہیں۔

صحابہ سے محبت وعقیدت ہر طرح کے غلو وتشدد سے پاک ہونی چاہیے۔ صحابہ کی دینی خدمات کا اعتراف، ان کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جان نثاریوں کا تذکرہ اور انھیں اپنے لیے دین دارانہ کردار میں لائق تقلید نمونہ سمجھنا مطلوب بھی اور محمود بھی ہے، لیکن ان کے ساتھ الوہی تصورات وابستہ کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔ خاص طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت اس حوالے سے بہت کچھ زیر بحث رہتی ہے۔ حضرت علی کے ساتھ عقیدت میں غلو نے بعض ایسی شکلیں اختیار کر لی ہیں جو کسی طرح بھی جائز نہیں ہیں۔

متون

امام مسلم رحمہ اللہ نے اس روایت کا ایک ہی متن نقل کیا ہے۔ اس متن میں پہلے قسم ہے، اس کے بعد عہد کا بیان ہے اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت اور بغض کے دینی نتیجے کا تذکرہ ہے۔ عہد کا لفظ کم وبیش تمام متون میں مشترک ہے۔ قسم کا ذکر بعض متون میں ہے اور بعض متون میں نہیں ہے۔ مسلم کے متن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے متعلق بات متکلم کی ضمیروں کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ بعض متون میں یہی بات مخاطب کے صیغوں میں بیان ہوئی ہے۔

کتابیات

مسلم، رقم ۸۷؛ ابن حبان، رقم ۶۹۲۴؛ نسائی، رقم ۵۰۱۸؛ ابن ماجہ، رقم ۱۱۴؛ السنن الکبریٰ، رقم ۸۱۵۳، ۸۴۸۵، ۸۴۸۷، ۱۱۷۴۹، ۱۱۷۵۳؛ احمد، رقم ۳۱۷، ۱۰۶۲؛ مسند ابو یعلیٰ، رقم ۲۹۱؛ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۲۰۶۴؛ فضائل صحابہ، رقم ۹۴۸۔

محمد رفیع مفتی

اخلاقیات

(۲)

صراطِ مستقیم کی مثال

۱۔ عَنْ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ الْكِلَابِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ اللَّهَ ضَرَبَ مَثَلًا صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا عَلَى كَنَفَيْ الصِّرَاطِ زُورَانِ لَهُمَا أَبْوَابٌ مُفَتَّحَةٌ عَلَى الْأَبْوَابِ سُتُورٌ وَدَاعٍ يَدْعُو عَلَى رَأْسِ الصِّرَاطِ وَدَاعٍ يَدْعُو فَوْقَهُ ﴿وَاللَّهُ يَدْعُوا إِلَى دَارِ السَّلَامِ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ وَالْأَبْوَابُ الَّتِي عَلَى كَنَفَيْ الصِّرَاطِ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا يَقَعُ أَحَدٌ فِي حُدُودِ اللَّهِ حَتَّى يُكْشَفَ السِّتْرُ وَالَّذِي يَدْعُو مِنْ فَوْقِهِ وَاعِظُ رَبِّهِ۔ (ترمذی، رقم ۲۸۵۹)

''نواس بن سمعان کلابی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے صراطِ مستقیم کی مثال بیان کی ہے کہ وہ ایسا راستہ ہے جس کے دونوں طرف دو دیواریں ہیں، جن میں جا بجا دروازے کھلے ہوئے ہیں اور اُن پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ایک بلانے والا اس راستے کے سرے پر بلا رہا ہے اور دوسرا اس کے اوپر سے بلا رہا ہے۔ ﴿اللہ دارالسلام (جنت) کی طرف بلاتا ہے اور وہ جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دیتا ہے﴾۔ یہ دروازے جو صراطِ مستقیم کی دونوں اطراف پر ہیں، یہ اللہ کی حدود ہیں، کوئی شخص بھی ان حدود میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ پردہ نہ اٹھایا جائے اور وہ جو اس راستے

کے اوپر سے بلا رہا ہے وہ اس کے رب کا ایک واعظ ہے۔"

(۲) عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ الْأَنْصَارِيِّ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا وَعَلَى جَنْبَتَيِ الصِّرَاطِ سُورَانِ فِيهِمَا أَبْوَابٌ مُفَتَّحَةٌ وَعَلَى الْأَبْوَابِ سُتُورٌ مُرْخَاةٌ وَعَلَى بَابِ الصِّرَاطِ دَاعٍ يَقُولُ أَيُّهَا النَّاسُ ادْخُلُوا الصِّرَاطَ جَمِيعًا وَلَا تَتَفَرَّجُوا وَدَاعٍ يَدْعُو مِنْ جَوْفِ الصِّرَاطِ فَإِذَا أَرَادَ يَفْتَحُ شَيْئًا مِنْ تِلْكَ الْأَبْوَابِ قَالَ وَيْحَكَ لَا تَفْتَحْهُ فَإِنَّكَ إِنْ تَفْتَحْهُ تَلِجْهُ وَالصِّرَاطُ الْإِسْلَامُ وَالسُّورَانِ حُدُودُ اللّٰهِ تَعَالَى وَالْأَبْوَابُ الْمُفَتَّحَةُ مَحَارِمُ اللّٰهِ تَعَالَى وَذَلِكَ الدَّاعِي عَلَى رَأْسِ الصِّرَاطِ كِتَابُ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَالدَّاعِي فَوْقَ الصِّرَاطِ وَاعِظُ اللّٰهِ فِي قَلْبِ كُلِّ مُسْلِمٍ۔ (مسند احمد، رقم ۱۷۱۸۲)

"نواس بن سمعان انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے صراطِ مستقیم کی مثال بیان کی ہے کہ اس (راستے) کے دونوں طرف دو دیواریں کھنچی ہوئی ہیں، ان میں جا بجا کھلے ہوئے دروازے ہیں، جن پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ راستے کے سرے پر ایک پکارنے والا پکار رہا ہے کہ اے لوگو سب اس راستے پر آ جاؤ اور اس سے نہ ہٹو اور ایک پکارنے والا اس کے اندر سے پکار رہا ہے، چنانچہ جب کوئی شخص ان دروازوں میں سے کسی کا پردہ اٹھانا چاہتا ہے تو وہ پکار کر کہتا ہے: خبردار، پردہ نہ اٹھانا۔ اٹھاؤ گے تو اندر چلے جاؤ گے۔ (آپ نے فرمایا:) یہ راستہ اسلام ہے، دیواریں اللہ کے حدود ہیں، دروازے اُس کی قائم کردہ حرمتیں ہیں، راستے کے سرے پر پکارنے والا منادی قرآن مجید ہے اور راستے کے اوپر سے پکارنے والا منادی خدا کا وہ واعظ ہے جو ہر بندۂ مومن کے دل میں موجود ہے"۔

توضیح:

ان احادیث میں صراط مستقیم، اس کے اردگرد موجود دنیوی ترغیبات، اِن ترغیبات کا انسان کیسے شکار ہوتا ہے، قرآن مجید کی دعوت کیا ہے اور ضمیر انسان کی زندگی میں کیا کردار ادا کرتا ہے، اس سب کچھ کو بہت عمدہ اور بڑی واضح تمثیل میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس دنیا کو بڑی متوازن صورت میں آزمایش بنایا ہے۔ اس میں اگر ایک طرف نافرمانی کی ترغیبات موجود ہیں تو اُس کے مقابل میں اس سے روکنے کے لیے تنبیہات بھی موجود ہیں، چنانچہ یہاں اگر کوئی شخص جرم کرتا ہے تو وہ صرف اپنے فیصلے اور اپنے ارادے ہی سے کرتا ہے۔ وہ کسی دوسرے کو اپنی بدعملی کا ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتا۔

اعمالِ صالحہ کا دار و مدار

(۱) عَلْقَمَةَ بْنَ وَقَّاصٍ اللَّيْثِيَّ يَقُولُ سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَلَى الْمِنْبَرِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِءٍ مَا نَوَى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا أَوْ إِلَى امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ (بخاری، رقم ۱)، (مسلم، رقم ۴۹۲۷)

''علقمہ بن وقاص لیثی کہتے ہیں کہ میں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو منبر پر یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: اعمال کا دار و مدار تو بس نیتوں پر ہے۔ ہر آدمی کے لیے وہی کچھ ہوگا جس کی اُس نے نیت کی ہوگی۔ چنانچہ جس کی ہجرت دنیا کی کسی چیز کے لیے ہوئی جسے وہ پانا چاہتا تھا یا کسی عورت کی خاطر ہوئی جس سے وہ نکاح کرنا چاہتا تھا تو اُس کی ہجرت (خدا اور اُس کے رسول کے لیے نہیں، بلکہ) اسی چیز کے لیے شمار ہوگی جس کی خاطر اُس نے ہجرت کی ہوگی۔''

(۲) عَنْ أَبِي هُرَيْره.... سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: إِنَّ أَوَّلَ النَّاسِ يُقْضَى يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَيْهِ رَجُلٌ اسْتُشْهِدَ فَأُتِيَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا قَالَ قَاتَلْتُ فِيكَ حَتَّى اسْتُشْهِدْتُ قَالَ كَذَبْتَ وَلَكِنَّكَ قَاتَلْتَ لِأَنْ يُقَالَ جَرِيءٌ فَقَدْ قِيلَ ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلَى وَجْهِهِ حَتَّى أُلْقِيَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ

تَعَلَّمَ الْعِلْمَ وَعَلَّمَهُ وَقَرَأَ الْقُرْآنَ فَأُتِيَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا قَالَ تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وَعَلَّمْتُهُ وَقَرَأْتُ فِيكَ الْقُرْآنَ قَالَ كَذَبْتَ وَلَكِنَّكَ تَعَلَّمْتَ الْعِلْمَ لِيُقَالَ عَالِمٌ وَقَرَأْتَ الْقُرْآنَ لِيُقَالَ هُوَ قَارِءٌ فَقَدْ قِيلَ ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلَى وَجْهِهِ حَتَّى أُلْقِيَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ وَسَّعَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَعْطَاهُ مِنْ أَصْنَافِ الْمَالِ كُلِّهِ فَأُتِيَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا قَالَ مَا تَرَكْتُ مِنْ سَبِيلٍ تُحِبُّ أَنْ يُنْفَقَ فِيهَا إِلَّا أَنْفَقْتُ فِيهَا لَكَ قَالَ كَذَبْتَ وَلَكِنَّكَ فَعَلْتَ لِيُقَالَ هُوَ جَوَادٌ فَقَدْ قِيلَ ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلَى وَجْهِهِ ثُمَّ أُلْقِيَ فِي النَّارِ۔ (مسلم، رقم ۱۹۰۵، رقم مسلسل ۴۹۲۳)

''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: قیامت کے دن سب سے پہلے اُس شخص کا فیصلہ کیا جائے گا جو دنیا میں شہید ہوا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں لایا جائے گا، پھر اللہ تعالیٰ اُسے اپنی نعمتیں یاد دلائے گا، وہ ان سب کو تسلیم کرے گا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو نے اِن نعمتوں کو پا کر کیا اعمال کیے۔ وہ کہے گا: اے باری تعالیٰ میں تیری راہ میں لڑا، یہاں تک کہ میں شہید ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کہے گا: تو جھوٹ بولتا ہے تو میری راہ میں نہیں، بلکہ اِس لیے لڑا تھا کہ تو بہادر کہلائے اور وہ تو کہلا چکا۔ پھر اُسے جہنم میں پھینکنے کا حکم ہو گا، چنانچہ وہ اوندھے منہ گھسیٹتے ہوئے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

دوسرا وہ شخص ہو گا جس نے علم سیکھا اور سکھایا اور قرآن پڑھا (اور پڑھایا) تھا۔ اُسے بھی اللہ تعالیٰ کے حضور میں لایا جائے گا، پھر اللہ تعالیٰ اُسے اپنی نعمتیں یاد دلائے گا، وہ اُن سب کو تسلیم کرے گا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو نے اِن نعمتوں کو پا کر کیا اعمال کیے۔ وہ کہے گا: اے باری تعالیٰ میں نے علم سیکھا اور سکھایا اور تیری خوشنودی کے لیے قرآن پڑھا (اور پڑھایا)۔ پروردگار کہے گا: تو جھوٹ کہتا ہے، تو نے میری خوشنودی کے لیے نہیں، بلکہ اس لیے علم سیکھا اور سکھایا تھا تا کہ لوگ تجھے عالم کہیں اور اس لیے قرآن پڑھا (اور پڑھایا) تا کہ یہ کہا جائے

کہ فلاں شخص قاری (قرآن کا معلم) ہے، اور یہ تجھے کہا جا چکا۔ پھر اُسے جہنم میں پھینکنے کا حکم ہوگا، چنانچہ وہ اوندھے منہ گھسیٹتے ہوئے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

تیسرا وہ شخص ہوگا جسے اللہ نے کشادگی عطا فرمائی اور ہر طرح کا مال دیا تھا۔ اُسے بھی اللہ تعالیٰ کے حضور میں لایا جائے گا، پھر اللہ تعالیٰ اُسے اپنی نعمتیں یاد دلائے گا، وہ اُن سب کو تسلیم کرے گا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے اِن نعمتوں کو پا کر کیا اعمال کیے۔ وہ کہے گا: اے باری تعالیٰ میں نے تیری رضا کی خاطر ہر اُس موقع پر انفاق کیا ہے، جہاں انفاق کرنا تجھے پسند تھا۔ اللہ تعالیٰ کہے گا: تو جھوٹ کہتا ہے تو نے میری رضا کے لیے نہیں، بلکہ اِس لیے مال خرچا تھا کہ لوگ تجھے سخی کہیں اور وہ تجھے کہا جا چکا۔ پھر اُسے بھی جہنم میں پھینکنے کا حکم ہوگا، چنانچہ وہ بھی اوندھے منہ گھسیٹتے ہوئے جہنم میں ڈال دیا جائے گا''۔

توضیح:

کسی عمل کے بارے میں جو دعویٰ کیا جا رہا ہے کیا وہ عمل اپنی حقیقت میں بھی ویسا ہی ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب اگر 'ہاں' میں ہو تو اس عمل کو ہم خالص عمل قرار دیتے ہیں اور اگر اس کا جواب 'نہ' میں ہو تو پھر اس عمل کو ناخالص عمل قرار دیا جاتا ہے۔ ان احادیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا کسی ناخالص عمل کو ہرگز قبول نہیں کرے گا، بلکہ ایسے لوگوں کو ان کے یہ اعمال جہنم کا مستحق بنا دیں گے۔

مشرکانہ تصاویر پر وعید

(۱) عَنْ نَافِعٍ أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَخْبَرَهُ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنَّ الَّذِينَ يَصْنَعُونَ هٰذِهِ الصُّوَرَ يُعَذَّبُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُقَالُ لَهُمْ أَحْيُوا مَا خَلَقْتُمْ۔ (بخاری، رقم ۵۹۵۱)

''نافع سے روایت ہے کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے انھیں بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: یہ (مشرکانہ) تصویریں جو لوگ بناتے ہیں، اُنھیں قیامت میں عذاب دیا

جائے گا، اُن سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا ہے، اُسے اب زندہ کرو۔‘‘

توضیح:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا میں تشریف لائے تو اس وقت تمام دنیا میں اور خاص کر عرب میں بت پرستی بہت عام تھی۔ لوگ اپنے معبودوں کے بت تراشتے، ان کی تصاویر اور مجسمے بناتے اور انھیں اپنی عبادت گاہوں اور گھروں میں رکھتے تاکہ وہ ان کی پوجا کریں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل دعوت ہی توحید کی دعوت تھی۔ چنانچہ آپ نے ان مشرکانہ علامات اور مظاہر پر سخت تنقید کی اور مشرکین کو یہ وعید سنائی کہ جو لوگ یہ مشرکانہ تصویریں بناتے ہیں، اُنھیں قیامت میں سخت عذاب دیا جائے گا اور اُن سے یہ کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا ہے، اُسے اب زندہ کرو اور اُن سے مدد حاصل کرو، جیسا کہ تم سمجھتے تھے کہ یہ زندہ ہستیاں ہیں جو تمھیں نفع و نقصان دے سکتی ہیں۔

وسیم اختر مفتی

عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ

[''سیر وسوانح'' کے زیرعنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین
کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

عبدالرحمانؓ بن عوف عام فیل کے ۱۰ سال بعد مکہ میں پیدا ہوئے۔ زمانۂ جاہلیت میں عبدالکعبہ (یا عبدعمرو) کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ان کے دادا کا نام عبدعوف تھا، عبدالحارث بن زہرہ پردادا تھے اور ان کے والد کا نام کلاب بن مُرّہ تھا (مزی، ذہبی اور ابن عبدالبر نے عبد کو پردادا اور حارث کو ان کا والد بتایا ہے)۔ عبدالرحمانؓ کی والدہ کا نام شفا بنت عوف بن عبدالحارث تھا۔ یہ ان کے والد کی چچازاد تھیں۔ عبدالرحمانؓ کے نانا عوف بن عبدالحارث ان کے والد عوف بن عبدعوف کے چچا تھے۔ (ایک روایت کے مطابق صفیہ بنت عبدمناف ان کی والدہ تھیں)۔ چھٹی پشت کلاب پر عبدالرحمانؓ کا سلسلۂ نسب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ددھیال سے مل جاتا ہے، اس طرح وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہوئے۔ ایک رشتے سے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم زلف تھے۔ عبدالرحمانؓ کا قبیلہ زہرہ بن کلاب کی نسبت سے بنوزہرہ کہلاتا تھا۔ بنوزہرہ قریش کے خاندانوں میں زیادہ ممتاز نہ تھے۔ مناصب حرم میں سے کوئی منصب ان کے پاس نہ تھا۔ عبدالرحمانؓ کے والد عوف تاجر تھے۔ ایک بار عبدالرحمانؓ، ان کے والد عوف، عثمانؓ، ان کے والد عفان اور فاکہ بن مغیرہ (خالدؓ بن ولید کے چچا) تجارت کی غرض سے یمن گئے۔ راستے میں اہل بنوجذیمہ نے عوف اور فاکہ کو قتل کر دیا۔ عثمانؓ، عفان اور عبدالرحمانؓ بچ گئے۔ عبدالرحمانؓ نے اپنے والد کے قاتل خالد بن ہشام کو وہیں ختم کر دیا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے سرفراز ہوئے تو عبدالرحمانؓ کی عمر ۳۰ برس کے لگ بھگ تھی۔ اپنی فطری پاکیزہ روی کی وجہ

سے شراب جاہلیت ہی میں چھوڑ چکے تھے۔ پہلے مرد مومن سیدنا ابوبکرؓ نے مشرف بہ اسلام ہونے کے دو ہی دن بعد عبدالرحمانؓ کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تو انھوں نے فوراً لبیک کہا۔ اسلام کی طرف سبقت کرنے میں ان کا ۸ واں نمبر تھا۔ ابھی نبئ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دار ارقم میں منتقل ہو کر تبلیغ دین کا کام شروع نہ کیا تھا۔ آپ ﷺ نے ان کا مشرکانہ نام تبدیل کر کے عبدالرحمانؓ تجویز فرمایا۔ ان کے بھائیوں میں سے عبداللہ، اسود اور حمنن کے نام معلوم ہیں۔ عبداللہ اور اسود فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے۔

مشرکین مکہ نے دین حق کی طرف لپکنے والوں کو ایذائیں پہنچانا شروع کیں تو ۵ نبوی (۶۱۵ء) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا، تم حبشہ کی سرزمین کو نکل جاؤ، وہاں ایسا بادشاہ ہے جس کی حکومت میں ظلم نہیں ہوتا۔ ماہ رجب میں ۱۵ افراد پر مشتمل پہلا قافلہ تعمیل ارشاد میں حبشہ کو روانہ ہوا۔ تب عبدالرحمانؓ کی دو بیویاں تھیں، وہ بھی اپنے بال بچوں کو مکہ میں چھوڑ کر ہجرت کرنے والوں میں شامل ہو گئے۔ شوال ۵ نبوی میں ان مہاجرین اسلام نے مکہ واپسی کا قصد کیا۔ انھیں خبر ملی تھی کہ تمام اہل مکہ ایمان لے آئے ہیں۔ مکہ پہنچنے سے پہلے ہی ان کو معلوم ہو گیا کہ یہ اطلاع غلط تھی تو عبداللہؓ بن مسعود کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے راہ نمائی حاصل کرنے کے لیے مکہ بھیجا گیا۔ آپ ﷺ نے مکہ آنے سے منع فرما دیا کیونکہ قریش کی ایذا رسانیاں جاری تھیں چنانچہ یہ پھر حبشہ لوٹ گئے۔ اب کچھ اور مہاجرین بھی ان کے ساتھ شامل تھے۔ یہ لوگ حبشہ میں کئی سال مقیم رہے، ان میں سے کچھ مسلمانوں کے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد براہ راست دار ہجرت ہی آئے۔ عبدالرحمانؓ بن عوف ان لوگوں میں سے تھے جو مکہ لوٹے اور پھر مدینہ کو ہجرت کی۔ گمان غالب ہے کہ وہ ۱۳ نبوی میں مدینہ جانے والے تیسرے قافلے میں شامل تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار و مہاجرین میں مواخات قائم فرمائی تو بنوخزرج کی شاخ بنوحارث سے تعلق رکھنے والے سعدؓ بن ربیع کو ان کا انصاری بھائی قرار دیا۔ سعدؓ نے کہا، بھائی! میں مدینہ میں سب سے زیادہ مال دار آدمی ہوں۔ میرے ۲ باغ اور ۲ بیویاں ہیں۔ جو باغ تمھیں اچھا لگتا ہے، تمہارے لیے چھوڑ دیتا ہوں اور جو بیوی تم کو پسند آتی ہے، میں اسے طلاق دے کر تمھیں سونپ دیتا ہوں۔ ابن عوفؓ نے جواب دیا، اللہ تمہارے اہل و عیال اور مال و دولت میں خوب برکت دے۔ مجھے بتا دو، یہاں قریبی بازار کون سا ہے؟ سعدؓ نے کہا، بازار قینقاع۔ صبح سویرے عبدالرحمانؓ نے بازار کا رخ کیا۔ کچھ سامان تجارت پاس تھا جسے فروخت کر کے انھوں نے معقول منافع کمایا اور شام کو گھی اور پنیر لے کر گھر لوٹے۔ اسی طرح تجارت کرتے کچھ دیر گزری تھی کہ ان کا شمار مدینہ کے متمول افراد میں ہونے لگا، اس قدر غلہ اور سامان تجارت ہو گیا کہ اسے ڈھونے کے لیے کئی سو اونٹوں کی ضرورت پڑتی۔ اپنی اس

وقت کی خوش بختی کا بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا، میں کوئی پتھر بھی اٹھاتا تو توقع ہوتی کہ اس کے نیچے سے سونا چاندی ملے گا۔ مدینہ آنے کے بعد انھوں نے امیہ بن خلف سے تجارتی معاہدہ بھی کیا۔ ایک دن خدمت نبوی میں حاضر ہوئے تو ان کے کپڑوں پر زعفران کا داغ لگا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا، خیر تو ہے؟ یا رسول اللہ میں نے شادی کر لی ہے، انھوں نے بتایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا، بیوی کو مہر میں کیا دیا ہے؟ کھجور کی ایک گٹھلی کے ہم وزن سونا، عبدالرحمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، ولیمہ ضرور کرنا، چاہے ایک بکری ہی ذبح کر لینا۔ ابن ابی لیلیٰ کی روایت ہے، عبدالرحمان رضی اللہ عنہ بن عوف نے ۳۰ ہزار درہم مہر دے کر ایک انصاری عورت (غالباً سہلہ رضی اللہ عنہا بنت عاصم) سے شادی کی۔

پھر وہ وقت آیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں مہاجرین اہل ایمان کے لیے گھروں کا نقشہ ترتیب فرمایا۔ عبدالرحمان رضی اللہ عنہ کے قبیلہ بنوزہرہ کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کے پچھلی جانب جگہ مختص فرمائی۔ عبدالرحمان رضی اللہ عنہ کے حصہ میں کھجوروں کا ایک جھنڈ آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ وعدہ بھی فرمایا، اللہ نے چاہا تو شام مسلمانوں کے ہاتھ آئے گا، تم سلیل نامی جگہ لے لینا۔

حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ بڑے دلیر اور جری تھے۔ بدر، احد اور خندق کی جنگوں اور تمام غزوات میں وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہے۔ بدر کے دن سائب بن ابورفاعہ اور ایک روایت کے مطابق عمیر بن عثمان ان کے ہاتھوں جہنم واصل ہوئے۔ ابوجہل کو انجام تک پہنچانے والے دو پرعزم انصاری لڑکوں معاذ رضی اللہ عنہ بن عفرا اور معاذ رضی اللہ عنہ بن عمرو کی راہنمائی بھی انھوں نے ہی کی۔ اسی یوم فرقان کو عبدالرحمان رضی اللہ عنہ کے پرانے حلیف امیہ بن خلف اور اس کے بیٹے علی نے ہتھیار ڈال دیے تاکہ جنگی قیدی بن کر قتل ہونے سے بچ جائیں۔ عبدالرحمان رضی اللہ عنہ انھیں حفاظت سے لے جا رہے تھے کہ بلال رضی اللہ عنہ نے دیکھ لیا۔ وہ پکارے، او اللہ کے انصار! یہ رئیس الکفار امیہ جا رہا ہے۔ وہ اپنے پرانے آقا سے صرف نظر کیسے کر سکتے تھے، یہی امیہ تھا جو انھیں مکہ کی گرم ریت پر لٹا کر سینے پر پتھر رکھ دیا کرتا تھا۔ بلال رضی اللہ عنہ کی پکار پر لپکنے والے انصاری مسلمانوں نے امیہ اور اس کے بیٹے علی کو تلواروں کی زد میں لے لیا اور آناً فاناً دونوں کو جہنم واصل کر دیا۔ امیہ کو بچانے کی کوشش میں ایک زخم عبدالرحمان رضی اللہ عنہ کے پاؤں پر بھی لگا۔ جنگ احد میں عبدالرحمان رضی اللہ عنہ نے خوب ثابت قدمی دکھائی اور شدید زخمی ہوئے۔ ان کے سامنے کے دانت ٹوٹ گئے اور جسم پر بیس سے زیادہ زخم آئے۔ پاؤں اور ٹانگوں پر اتنی چوٹیں لگیں کہ لنگ آ گیا۔ اس روز انھوں نے کلاب بن طلحہ کو قتل کیا۔ اسی غزوہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حارث رضی اللہ عنہ بن صمہ سے عبدالرحمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں دریافت فرمایا۔ انھوں نے بتایا، میں نے انھیں جبل احد کی

پتھریلی زمین کی طرف جاتے دیکھا جب کہ مشرکوں کا ایک جتھا ان پر حملہ آور تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سن رکھو! فرشتے اس کے ساتھ لڑ رہے ہوں گے۔ حارث رضی اللہ عنہ لپک کر گئے تو دیکھا، ۷ مشرکوں کی لاشیں ان کے آگے پڑی ہیں۔ عبدالرحمان رضی اللہ عنہ نے بتایا، ارطاۃ بن عبد شرحبیل اور ان دو کافروں کو تو میں نے مارا ہے۔ باقی کیسے مرے؟ مجھے پتا نہیں چل سکا۔ شعبان ۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرحمان رضی اللہ عنہ بن عوف کو ۷۰۰ صحابہ رضی اللہ عنہم کے لشکر کا قائد بنا کر دومۃ الجندل بھیجا جہاں بنوکلب حکم ران تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے عبدالرحمان رضی اللہ عنہ کی پگڑی کھولی اور انھیں سیاہ رنگ کا عمامہ باندھا۔ عمامے کا شملہ (لڑ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرحمان رضی اللہ عنہ کے کندھوں کے درمیان لٹکا دیا۔ یہ ان کی امارت (command) کی نشانی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا، عبدالرحمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں علم دے دو اور یہ کہہ کر رخصت فرمایا، ''اللہ کا نام لے کر سفر کرو۔'' یہ جیش دومۃ الجندل پہنچا اور وہاں کے اہلیان کو دین حق کی دعوت دی۔ کچھ پس و پیش کے بعد ان کا نصرانی سردار اصبغ ایمان لے آیا تو عبدالرحمان رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع بھیجی۔ انھوں نے بنوکلب میں شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رئیس اصبغ کی بیٹی تماضر سے نکاح کرنے کی اجازت دی۔ عبدالرحمان رضی اللہ عنہ نے ولیمہ منعقد کیا اور مدینہ آ گئے۔ یہ خاتون ابوسلمہ فقیہ کی والدہ ہوئیں۔ ۶ھ ہی میں غزوۂ بنی مصطلق ہوا جس میں کافروں کا احمر نامی شہ سوار عبدالرحمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں جہنم رسید ہوا۔ صلح حدیبیہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرحمان رضی اللہ عنہ کو اشاعت اسلام کے لیے بنوجذیمہ بھیجا۔

غزوۂ تبوک (رجب ۹ھ) میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عبدالرحمان رضی اللہ عنہ بن عوف کے پیچھے نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس وقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نبی کی وفات نہیں ہوتی جب تک وہ اپنی امت کے کسی نیک آدمی کے پیچھے نماز نہیں پڑھ لیتا۔ اس واقعہ کو مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے وضاحت سے بیان کیا ہے۔ ان سے پوچھا گیا تھا، کیا سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی صحابی کی اقتدا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا کی ہے؟ انھوں نے تصدیق کرتے ہوئے بتایا، ''ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (تبوک کے) سفر میں شریک تھے۔ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرانے کے لیے پانی کا انتظام رکھنا میری ذمہ داری تھی)۔ سحر کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری اونٹنی کی گردن (یا پیٹھ) تھپکی تو مجھے معلوم ہو گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاجت ہے۔ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ہو لیا، ہم لوگوں کے جائے قیام سے دور نکل آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری سے اتر کر میری نگاہوں سے دور چلے گئے۔ کافی دیر کے بعد لوٹے تو پانی طلب فرمایا۔ میں اپنے کجاوے سے لٹکا ہوا مشکیزہ لے آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شامی جبہ زیب تن کیا ہوا تھا جس کی آستینیں تنگ تھیں اس لیے جبے کے اندر سے ہاتھ نکال کر منہ اور بازوؤں پر اچھی طرح پانی بہایا پھر پیشانی، عمامے اور موزوں پر

مسح فرمایا۔ہم اونٹیوں پرسوار ہوکر واپس آئے تو دیکھا کہ لوگوں نے عبدالرحمانؓ بن عوف کی امامت میں نماز شروع کر رکھی ہے۔ میں عبدالرحمانؓ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی اطلاع دینے کے لیے آگے بڑھا تو آپ ﷺ نے منع فرما دیا۔ہم نے اسی جماعت میں شامل ہو کر ایک رکعت پڑھی اور رہنے والی رکعت سلام پھرنے کے بعد ادا کی‘‘۔اہل ایمان پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے پہلے نماز شروع کر دینے پر بہت گھبرائے اور خوب تسبیحیں کرنے لگے۔ آپ ﷺ نے سلام پھیر کر انھیں تسلی دی،تم نے اچھا اور درست کیا کہ نماز وقت پر ادا کر لی۔

فتح مکہ کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مضافات مکہ میں کئی سرایا بھیجے جن کا مقصد جنگ کے بجائے اسلام کی دعوت دینا تھا۔ایک سریہ خالدؓ بن ولید کی قیادت میں زیریں تہامہ گیا۔وہاں آباد بنو جذیمہ نے مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا لیکن پھر ہتھیار ڈال کر صلح کر لی۔خالدؓ بن ولید نے پھر بھی ان کی مشکیں کس کر کچھ لوگوں کو قتل کر ڈالا۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو ہاتھ اٹھا کر فرمایا،اللہ! میں تم سے خالدؓ کے عمل سے بری ہونے کی دعا کرتا ہوں۔آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو بھیج کر بنو جذیمہ کو دیتیں بھی دلائیں۔اس موقع پر عبدالرحمانؓ بن عوف نے خالدؓ کو ملامت کی کہ تم نے اپنے چچا فاکہ کے قتل کا بدلہ لے کر جاہلیت کا کام کیا ہے۔خالدؓ نے بھی ان کو برا بھلا کہا تو ان کا جھگڑا بڑھ گیا۔آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی تو فرمایا،’’میرے صحابہؓ میں سے کسی کو گالی نہ دو۔اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کے برابر سونا انفاق کر دے تو بھی کسی صحابیؓ جتنا یا اس سے آدھا مقام بھی حاصل نہیں کر سکتا‘‘۔

اصحابؓ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔السابقون الاولون (سورۂ توبہ:۱۰۰) میں شامل ہونے کے ساتھ وہ ان ۱۰ جلیل القدر صحابہ،عشرۂ مبشرہ میں سے تھے جنھیں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا ہی میں جنت کی بشارت دے دی تھی (ترمذی: ۳۷۵۷، مسند احمد:۱۶۲۹،۱۶۷۵)۔وہ اہل بدر میں سے تھے جن کے بارے میں ارشاد نبوی ہے،’’اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو جانچ لیا اور فرمایا،تم جو عمل چاہے کرو، میں نے تمھیں بخش دیا ہے (بخاری:۳۰۰۷،مسلم ۶۳۵۱)۔ابن عوفؓ بیعت رضوان میں بھی شامل تھے،اس میں شرکت کرنے والوں سے اللہ کا راضی ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے۔(سورۂ فتح:۱۸) ان کی خوش بختی کی اس سے بڑی دلیل کیا ہوگی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پوری حیات مبارکہ میں ان سے راضی رہے۔انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حواری کہا جاتا تھا (مستدرک حاکم:۵۳۵۱)۔ہر پیغمبر کا مخلص ساتھی حواری کا نام پاتا،پیغمبر اسلام نے زبیرؓ بن عوام کو بھی اپنا حواری قرار دیا تھا (بخاری:۲۶۱۷،مسلم:۶۱۳۹)۔

شیخین ابوبکرؓ و عمرؓ کے عہد ہائے خلافت میں بھی ان کا رول اہم رہا۔نو منتخب ہونے کے بعد حضرت ابوبکرؓ جیش

اسامہؓ کو رخصت کرنے نکلے تو پیدل تھے۔ان کی سواری کی مہار عبدالرحمانؓ کے ہاتھ میں تھی۔قتال ردہ کے بعد امن ہونے کی خوش خبری عبدالرحمانؓ ہی نے سنائی تھی۔۱۱ھ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ حج کو نہ جا سکے۔ایک قول کے مطابق انھوں نے عبدالرحمانؓ کو اپنی جگہ امیر حج مقرر کیا۔خلیفۂ اولؓ نے انتقال سے پہلے عمرؓ کو اپنا جانشین مقرر کیا تو عبدالرحمانؓ بن عوف سے خصوصی مشورہ کیا۔

عبدالرحمانؓ حضرت عمرؓ کی شوریٰ کے مستقل اور سرگرم رکن تھے۔لوگ حضرت عمرؓ کو کچھ کہنا یا ان سے پوچھنا چاہتے تو حضرت عثمانؓ یا حضرت عبدالرحمانؓ سے رابطہ کرتے۔۱۳ھ، اپنی خلافت کے پہلے سال عمرؓ نے عبدالرحمانؓ کو امیر حج بنا کر بھیجا۔۱۴ھ میں عراق پر فوج کشی کا فیصلہ ہوا تو عبدالرحمانؓ میمنہ کے سربراہ بنائے گئے۔اس موقع لوگوں نے حضرت عمرؓ کو لشکر کی قیادت کرنے کا مشورہ دیا تو عبدالرحمانؓ تھے جنھوں نے اس رائے کی سختی سے مخالفت کی۔انھوں نے کہا، خدانخواستہ، اگر آپ میدان جنگ میں کام آ گئے یا آپ کے لشکر کو شکست ہوگئی تو اسلام کا خاتمہ ہو جائے گا۔تب عمرؓ کی جگہ سپہ سالار مقرر کرنے کا مسئلہ پیدا ہوا تو بھی عبدالرحمانؓ ہی نے حل کیا۔انھوں نے کہا، میں نے پا لیا! عمرؓ نے پوچھا، کون؟ بولے، سعدؓ بن مالک (سعدؓ بن ابی وقاص)۔جنگ یرموک میں اس کے برعکس انھوں نے حضرت عمرؓ کو سپہ سالار بننے کی تجویز دی لیکن دوسرے صحابہؓ نہ مانے۔۱۵ھ میں بیت المقدس فتح ہوا۔اس وقت حضرت عمرؓ کی موجودگی میں جابیہ کے مقام پر ایک معاہدہ لکھا گیا۔عبدالرحمانؓ نے اس پر گواہ کی حیثیت سے دستخط ثبت کیے۔عہد فاروقیؓ کا ایک اہم واقعہ ۱۸ھ میں شام و فلسطین کے علاقے عمواس میں پھوٹنے والی طاعون کی وبا تھی۔تب عمرؓ شام کے سفر پر روانہ ہو کر سرغ تک پہنچے تھے کہ وبا کی اطلاع مل گئی۔انھوں نے سفر موقوف کر کے وہیں سے مدینہ لوٹنے کا ارادہ کیا لیکن ابوعبیدہؓ بن جراح نے مخالفت کی اور کہا، کیا تقدیر الٰہی سے بھاگ کر جا رہے ہیں؟ بہت سے صحابہؓ سے مشورہ کیا گیا تاہم عبدالرحمانؓ کی رائے فیصلہ کن ہوئی۔انھوں نے کہا، اس بارے میں میرے پاس علم ہے۔پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سنایا، ''جب کسی شہر میں کوئی وبا پھیل جائے اور تم وہاں نہ ہو تو وہاں نہ جاؤ۔اور اگر وبا اس جگہ پھوٹے جہاں تم ہو تو وہاں سے نہ بھاگو۔جنگ نہاوند (فتح الفتوح) میں عبدالرحمانؓ کا مشورہ تھا، امیر المومنینؓ محاذ جنگ پر نہ جائیں پھر جب اس جنگ کا بے شمار مال غنیمت مدینہ آیا تو مسجد نبوی میں رکھا گیا اور عبدالرحمانؓ اور کچھ دوسرے صحابہؓ نے رات کو پہرا دیا۔سیدنا عمرؓ نے ان کی خوبیوں کی بنا پر انھیں العدل الرضی (عادل اور پسندیدہ) کے خطاب سے نوازا۔ایک موقع پر جب عمر فاروقؓ کی سختی اور ان کے درہ چلانے سے لوگ خوف زدہ ہو گئے تو اکابر صحابہؓ نے اس موضوع پر ان سے بات کرنے کے لیے عبدالرحمانؓ ہی کا انتخاب کیا۔

حضرت عمرؓ ازواج مطہراتؓ کو عام طور پر سفر سے منع کرتے تھے۔ اپنی زندگی کے آخری سال ۲۳ھ میں انھوں نے ان کو حج پر جانے کی دعوت دی۔ وہ محمل نشین ہوئیں تو حضرت عثمانؓ اونٹنی پر سوار ہو کر ان کے آگے آگے چلے، وہ کسی کو ان کے پاس آنے نہ دیتے۔ حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف امہات المومنینؓ کی حفاظت کے لیے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ راستے میں جب پڑاؤ ڈلتا، دونوں اصحابؓ انھیں اترائی میں اتارتے، خود کنارے پر رہتے اور لوگوں کو ان کے پاس جانے سے روکتے۔

بدھ ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ھ کو حضرت عمرؓ نماز فجر پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے تو مغیرہؓ بن شعبہ کے ایرانی غلام ابولؤلؤ فیروز نے حملہ کر کے انھیں شدید زخمی کر دیا۔ تب انھوں نے حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف کو مصلی پر کھڑا کیا۔ عبدالرحمانؓ نے سورۂ عصر اور سورۂ کوثر کی تلاوت کر کے مختصر نماز پڑھائی۔ بعض روایات کے مطابق حضرت عمرؓ اپنے بعد خلافت کی ذمہ داری عبدالرحمانؓ پر ڈالنا چاہتے تھے۔ وہ راضی نہ ہوئے تو انھوں نے تیسرے خلیفہ کے انتخاب کے لیے عشرۂ مبشرہ میں سے ۶ اصحابؓ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک کمیٹی بنا دی اور ابن عوفؓ کو اس میں شامل رکھا۔ انھوں نے اہل ایمان کو نصیحت کی، اگر خلافت عبدالرحمانؓ کے پاس آئی تو ان کی بات ماننا۔ کئی صحابہؓ انھیں خلیفہ دیکھنا چاہتے تھے لیکن انھوں نے معذرت کر لی اور حضرت عثمانؓ کے انتخاب میں کلیدی کردار ادا کیا۔ سعدؓ بن ابی وقاص نے انھیں خلیفہ بننے کا مشورہ دیا تو انھوں نے کہا، عمرؓ کے بعد جو بھی اس ذمہ داری کو اٹھائے گا، لوگ اسے ملامت ہی کریں گے۔ آخر کار عبدالرحمانؓ نے نئے خلیفہ کا چناؤ کرنے والی شوریٰ کے ارکان سے کہا، کیا تم اجازت دیتے ہو کہ میں تمھارا خلیفہ چنوں اور خود اس منصب سے الگ رہوں؟ حضرت علیؓ نے کہا، (آپ جو انتخاب کریں گے) میں سب سے پہلے مانوں گا کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا ہے، ''عبدالرحمان! تم آسمان والوں میں امانت دار شمار ہو گے اور اہل زمین میں بھی تمھاری امانت مسلم ہے۔''

اپنی خلافت کے پہلے سال ۲۴ھ میں حضرت عثمانؓ نکسیر پھوٹنے کی وجہ سے حج پر نہ جا سکے تو عبدالرحمانؓ کو امیر حج بنایا۔ عہد عثمانیؓ میں وہ مدینہ میں مقیم رہے اور حضرت عثمانؓ کی شوریٰ میں شامل ہو کر خلافت کے استحکام کی کوشش کرتے رہے۔ ۳۱ھ میں حضرت عثمانؓ کو ایک بار پھر نکسیر پھوٹی، ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو اپنے غلام حمران بن ابان کو بلا کر وصیت لکھوائی کہ میرے بعد عبدالرحمانؓ خلیفہ ہوں گے۔ عبدالرحمانؓ کو معلوم ہوا تو دعا کی، اللہ! مجھے عثمانؓ سے پہلے اٹھا لے۔ ۶ ماہ ہی گزرے تھے کہ وہ چل بسے۔

عبدالرحمانؓ بن عوف میں حب دنیا کا شائبہ نہ تھا حالانکہ عام تجربہ ہے، زیادہ مال دار لوگ اللہ سے دور اور انسانی

ہم دردی سے عاری ہوتے ہیں۔ پیغمبر آخر الزماں کا پیارا اور قریبی ساتھی ایسا ہو بھی نہ سکتا تھا، آپ ﷺ نے اپنے صحابہؓ کے دلوں میں دنیا کی محبت ذرا بھی رہنے نہ دی تھی۔ ابوامامہ باہلیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، ''کل شب مجھے خواب دکھائی دیا، میں جنت میں داخل ہو رہا ہوں۔ اپنے آگے ایک آہٹ سنائی دی تو پوچھا، جبریلؑ! یہ کون ہیں؟ جواب ملا، بلالؓ۔ پھر میں چلتا گیا تو دیکھا کہ بیشتر اہل جنت غریب مہاجرین اور مسلمان لڑکے بالے ہیں۔ مجھے عورتیں اور مال دار مرد بہت کم نظر آئے۔ بتایا گیا کہ امیر لوگ دروازے پر رک کے حساب دے رہے ہیں اور عورتوں کو زر و ریشم کے شغف نے مشغول کر رکھا تھا۔۔۔ میری امت ایک ایک شخص کر کے میرے سامنے پیش کی گئی۔ مجھے خیال آیا، بہت دیر ہو گئی، عبدالرحمانؓ بن عوف نہیں آئے۔ وہ ایاسؓ کے بعد پہنچے اور کہا، یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ ﷺ پر فدا ہوں۔۔۔ مجھے گمان ہونے لگا تھا، آپؐ کو کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔ پھر بتایا، زیادہ مال دار ہونے کی وجہ سے میری چھان پھٹک ہو رہی تھی۔'' ایک دوسری روایت میں ہے، ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''میرے پاس جبریلؑ آئے اور کہا، ابن عوفؓ سے کہہ دیں، مہمان کی خاطر داری کرے، غریب مسکین کو کھانا کھلائے اور مانگنے والے حاجت مند کی مدد کرے۔ عطا کی ابتدا اس شخص سے کرے جس کے نان نفقہ کا وہ ذمہ دار ہے۔ اگر اس نے ایسا کر لیا تو اس کے مال کا تزکیہ ہو جائے گا۔'' آپ ﷺ کی ایسی تمثیلوں اور نصیحتوں کا نتیجہ تھا کہ عبدالرحمانؓ بن عوف کی فطری سخاوت خوب پروان چڑھی۔ انھوں نے اپنا مال اسلام اور اہل اسلام کے لیے وقف کیے رکھا۔

غزوۂ تبوک (۹ھ) کے موقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام انفاق کی اپیل کی تو عبدالرحمانؓ کے پاس کل ۸ ہزار دینار تھے۔ انھوں نے نصف، ۴ ہزار راہ خدا میں دے دیے تو منافقین نے مذاق اڑا کر کہا، عبدالرحمانؓ بڑا ریاکار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عبدالرحمانؓ اور دوسرے مسلمانوں کے اخلاص کی خود شہادت دی اور ان سے ٹھٹھا کرنے والوں تیرہ باطنوں کے لیے کرب ناک عذاب کی وعید نازل کی۔ عہد نبویؐ ہی میں ایک موقع پر عبدالرحمانؓ نے ۴۰ ہزار دینار، دوسری بار پھر ۴۰ ہزار پھر دیے۔ انھوں نے مجاہدین اسلام کی سواری کے لیے ۵۰۰ گھوڑے اور ان کی خوراک و رسد کے لیے ۵۰۰ اونٹوں کا غلہ بھی فراہم کیا۔ ایک بار انھوں نے ایک ہی دن میں ۳۰ غلام آزاد کیے۔ عہد رسالت کے بعد کا واقعہ ہے، عبدالرحمانؓ بن عوف کا غلے اور بیش قیمت سامان سے لدا ہوا ۷۰۰ اونٹوں پر مشتمل قافلہ آیا تو مدینہ میں غل مچ گیا۔ سیدہ عائشہؓ اپنے گھر میں تشریف فرما تھیں، انھوں نے پوچھا، یہ غوغا کیسا ہے؟ تو بتایا گیا، عبدالرحمانؓ کا قافلہ ہر قسم کا ساز و سامان لے کر شام سے مدینہ میں وارد ہوا ہے۔ تب انھوں نے بتایا، میں نے رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (اپنا خواب بیان) فرماتے ہوئے سنا ہے، ''میں نے دیکھا کہ عبدالرحمانؓ جنت میں گھسٹ کر جا رہا ہے۔'' عبدالرحمانؓ کو معلوم ہوا تو کہا، میں کوشش کروں گا کہ چل کر جاؤں۔ یہ کہہ کر اونٹ، ان پر لدا ہوا غلہ، کجاوے اور پالان سب اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیے۔ عبدالرحمانؓ کے بھتیجے طلحہ بن عبداللہ (طلحة الندی) فرماتے ہیں، مدینہ کے سبھی باشندوں کا بوجھ عبدالرحمانؓ نے اٹھایا ہوا تھا۔ ۱/۳ کو وہ قرض دیتے، ۱/۳ کا قرض چکاتے اور ۱/۳ اہل مدینہ سے صلۂ رحمی کرتے۔ کسر نفسی اتنی تھی کہ اس کے باوجود اپنے آپ کو بخیل سمجھتے۔ ابو ہیاج کہتے ہیں، میں نے دیکھا کہ ایک لمبا آدمی کعبہ کا طواف کرتے ہوئے دعا کر رہا تھا۔ اللہ! مجھے اپنے نفس کے بخل سے بچاؤ۔ پوچھا تو معلوم ہوا، یہ عبدالرحمانؓ بن عوف ہیں۔

سیدنا عبدالرحمانؓ بن عوف عام انفاق کے ساتھ امہات المومنینؓ کی ضروریات کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ام المومنین سیدہ ام سلمہؓ کی روایت ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہراتؓ سے فرمایا، ''میرے بعد یہ سچا اور نیک انسان، عبدالرحمانؓ تمھارے ساتھ شفقت سے پیش آئے گا۔ اے اللہ! عبدالرحمانؓ کو جنت کے چشمہ سلسبیل سے سیراب کر۔'' عبدالرحمانؓ نے ۴ھ میں ہونے والے غزوۂ بنو نضیر سے مال غنیمت کے طور پر ملنے والے مال مویشی مدینہ کی بستی کیدمہ میں محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ یہ سب ۴۰ ہزار دینار میں بیچ کر انھوں نے رقم ازواج مطہراتؓ میں بانٹ دی۔ اسی طرح انھوں نے اپنی کچھ اراضی حضرت عثمانؓ کے ہاتھ ۴۰ ہزار دینار ہی میں بیچی اور حاصل ہونے والی قیمت اپنے قبیلے بنو زہرہ کے غربا، دوسرے حاجت مندوں اور امہات المومنینؓ میں تقسیم کر دی۔ ان کے بھانجے مسورؓ بن مخرمہ حضرت عائشہؓ کا حصہ لے کر ان کے پاس پہنچے تو انھوں نے پوچھا، یہ کس نے بھیجا ہے؟ عبدالرحمانؓ کا نام معلوم ہونے پر کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، میرے بعد اہل صبر ہی تم پر شفقت کریں گے۔ اللہ ابن عوف کو بہشت کے چشمہ سلسبیل سے سیراب کرے۔

عبدالرحمانؓ بن عوف محض دنیاوی دولت ہی نہ رکھتے تھے۔ وہ دین متین کے فلسفہ وحکمت اور اس کی فقہ و دانش کے علم سے بھی مالا مال تھے۔ عہد رسالت اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے عہد ہائے خلافت میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع کردہ ارشادات کی روشنی میں فتوی دیا کرتے تھے۔ عہد صدیقیؓ میں انھی کے رائے اور مشورہ سے میراث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ حل کیا گیا۔ حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں فقہ کا جو حصہ مرتب ہوا، عبدالرحمانؓ کی آرا اس میں شامل تھیں۔ خلیفۂ دومؓ کا مجوسیوں سے جزیہ لینے کا کوئی اردہ نہ تھا۔ عبدالرحمانؓ بن عوف نے بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیا تھا تو انھوں نے ان پر جزیہ عائد کیا۔ اسی زمانہ میں یہ سوال بھی اٹھا کہ آتش

پرستوں سے کیا معاملہ کیا جائے؟ تب عبدالرحمانؓ ہی نے راہ نمائی کی۔ انھوں نے کہا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ اہل کتاب کی روش اختیار فرما کر انھیں ذمی قرار دیا تھا۔ ایک بار حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ سے پوچھا۔ لڑکے! کیا تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی صحابیؓ سے اس مسئلہ کے بارے میں سنا ہے، کسی شخص کو نماز پڑھتے ہوئے شک ہو جائے (کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں) تو کیا کرے؟ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ عبدالرحمانؓ بن عوف آ گئے۔ انھوں نے بتایا، میں نے اس ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سن رکھا ہے۔ ''نماز پڑھتے ہوئے اگر کسی کو رکعتوں کی تعداد میں شک ہو جائے، ایک پڑھی ہے یا دو تو ایک شمار کرے۔ دو یا تین کا شک ہو تو سمجھ لے، دو پڑھی ہیں اور اگر تین یا چار کا تردّد ہو تو تین کا یقین کر لے۔ کم رکعتوں کا پایا جانا تو یقینی ہے اس لیے زیادہ کو وہم سمجھ لیا جائے۔ بھولنے والا نمازی نماز سے فارغ ہونے کے بعد سہو کے دو اضافی سجدے کرے''۔ ایک شخص نے حالت احرام میں ہرن کا شکار کر لیا اور حضرت عمرؓ سے فتویٰ لینے آیا۔ انھوں نے پاس کھڑے عبدالرحمانؓ سے مشورہ کر کے ایک بکری ذبح کرنے کو کہا۔

حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف کا ایک اور وصف خشیت الٰہی اور کسر نفسی تھی۔ ایک افطاری پر کھانے کے لیے بیٹھے تو کہا، ''(جنگ احد میں) مصعبؓ بن عمیر شہید ہوئے جو مجھ سے بہتر تھے۔ ان کو ایک ہی چادر کا کفن دیا گیا، سر ڈھانپا جاتا تو پاؤں ننگے ہو جاتے، پاؤں ڈھانکتے تو سر باہر ہو جاتا۔ (اسی غزوہ میں) حمزہؓ نے شہادت پائی جو مجھ سے اچھے تھے۔ اب ہمیں دنیا میں بہت کچھ مل گیا ہے کہ خدشہ ہوتا ہے، ہماری نیکیوں کا صلہ یہیں چکا دیا گیا ہے۔ پھر رونے لگے اور روتے روتے کھانا چھوڑ دیا''۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت عبدالرحمانؓ میں کوئی رنجش ہوئی۔ اس دوران میں طلحہؓ بیمار پڑ گئے تو عبدالرحمانؓ ان کی عیادت کے لیے پہنچ گئے۔ طلحہؓ نے کہا، بھائی! بخدا تو مجھ سے بہت بہتر ہے، اگر تو بیمار ہوتا تو میں بیمار پرسی کو نہ آتا۔

حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف کی وفات ۳۲ھ (۶۵۲ء) میں ہوئی جب ان کی عمر ۷۵ برس تھی۔ وہ ۶ ماہ سے بیمار تھے، اس دوران میں ایک بار ان پر غشی بھی طاری ہوئی۔ جنازے میں حضرت علیؓ بن ابی طالب، عمروؓ بن عاص، سعدؓ بن ابی وقاص، ابوسعید خدریؓ اور دوسرے صحابہؓ نے شرکت کی۔ نماز جنازہ حضرت عثمانؓ (ایک روایت کے مطابق زبیرؓ بن عوام) نے پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔ مدینے کا باغ حش، اس کی نواحی بستی کیدمہ جہاں بنونضیر سے ملنے والا مال غنیمت پڑا تھا اور مکے کا آبائی مکان ازرقی عبدالرحمانؓ کی جائیداد تھا۔ سلیل نام کی اراضی خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز کی تھی۔ انھوں نے اپنے ترکے میں ا ہزار اونٹ، ۳ ہزار بکریاں اور سو گھوڑے چھوڑے، یہ سب

نقیع کی چراگاہ میں چرتے تھے۔۲۰ اونٹ ان کی جرف کی زمینیں سیراب کرتے تھے۔سونا اتنا تھا کہ اسے کلہاڑی سے کاٹا گیا اور کاٹنے والوں کے ہاتھوں میں آبلے پڑ گئے۔عبدالرحمانؓ کی ۴ بیواؤں میں سے ہر ایک کو ۸۰ ہزار دینار ملے۔ان کے بیٹے ابراہیم کا بیان ہے، ایک بیوہ تماضر بنت اصبغ کو الاکھ ملے۔۵۰ ہزار دینار ان کی وصیت کے مطابق مسافروں کو دیے گئے۔جنگ بدر میں حصہ لینے والے ہر صحابیؓ کے لیے انھوں نے ۴۰۰ دینار کی وصیت کی تھی۔ان کی تعداد ۱۰۰ تھی، سب نے حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے بھی یہ رقم وصول کی۔حضرت عبدالرحمانؓ نے امہات المومنینؓ کے لیے ایک باغ کی وصیت کی جو ۴ لاکھ درہم میں فروخت ہوا۔اپنے غلاموں میں سے بیشتر کو انھوں نے آزاد کر دیا تھا۔

روایت حدیث میں بھی عبدالرحمانؓ بن عوف کا ایک حصہ ہے۔ان کی ۲ روایتیں متفق علیہ اور مفردات بخاری ۵ ہیں۔باقی کتب حدیث میں ۶۵ حدیثیں ان سے مروی ہوئی ہیں۔انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور عمرؓ بن خطاب سے احادیث روایت کیں۔ان سے روایت کرنے والوں میں شامل ہیں: ان کے بیٹے ابراہیمؒ، حمید، ابوسلمہ، عمر (ذہبی: عمرو) اور مصعب، ان کے بھانجے مسورؓ بن مخرمہؓ اور ان کے پوتے مسور بن ابراہیمؒ۔دیگر راویوں کے نام یہ ہیں: انسؓ بن مالک، جابرؓ بن عبداللہؓ، جبیرؓ بن مطعم اور ان کے بیٹے محمد، عبداللہؓ بن عباسؓ، عبداللہؓ بن عمرؓ، مالکؒ بن اوس، عبداللہ بن عامرؓ بن ربیعہ، عبداللہ بن عبداللہ بن حارث، عبداللہ بن قارظ، غیلان بن شرحبیل، قبیصہ بن ذؤیب، قیس بن ابی حازم، ردّاد لیثی، نوفل بن ایاس اور بجالہ بن عبدہ۔

ہجرت کے بعد حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف مکہ آئے تو اپنے زمانۂ جاہلیت والے گھر میں رہنا پسند نہ کیا۔

یہ حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف کی شخصیت کا اعجاز تھا کہ قریش کے بڑے بڑے سرداروں کی بیٹیوں سے ان کی شادیاں ہوئیں۔زمانۂ جاہلیت میں عتبہ بن ربیعہ کی بیٹی ام کلثوم سے ان کا عقد ہوا۔اس سے ان کا بیٹا سالم (بڑا) متولد ہوا جو اسلام کی آمد سے پہلے ہی فوت ہو گیا۔شیبہ بنت ربیعہ کی بیٹی سے بھی ان کی شادی ہوئی جس سے ان کی بیٹی ام قاسم پیدا ہوئی۔عقبہ بن ابی معیط کی بیٹی ام کلثومؓ سے عبدالرحمانؓ کی تیسری شادی ہوئی۔اس ام کلثومؓ سے شادی کا مشورہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دیا تھا۔اس سے ان کے چار بیٹوں محمد، ابراہیم، حُمید، اسماعیل اور دو بیٹیوں حمیدہ اور امۃ الرحمان (بڑی) نے جنم لیا۔اسی محمد سے وہ ابومحمد کنیت کرتے تھے۔عقبہ اور عتبہ دونوں کی بیٹیوں کا نام ام کلثوم تھا۔اس لیے ان کی اولاد کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ابن عبدالبر نے عبدالرحمانؓ کی ازواج میں بنت شیبہ کا نام ذکر نہیں کیا۔ایک نکاح انصار کے قبیلہ قضاعہ سے تعلق رکھنے والی خاتون سہلہ بنت عاصم سے

ہوا،اس سے معن ،عمر، زیداورامۃ الرحمان (چھوٹی) پیدا ہوئے۔بنوشیبان کی بحر یہ بنت ہانی سے بھی ان کا عقد ہوا۔ ان سے عروہ کی پیدائش ہوئی ۔عبدالرحمانؓ کا ایک بیاہ سہلہ بنت سہیل سے ہوا،ان سے سالم (چھوٹا) پیدا ہوا۔ایک بیٹا ابوبکر تھا جسے ان کی زوجہ ام حکیم بنت قارظ نے جنم دیا۔قبیلۂ اوس کے ایک اور انصاری ابوالحیس کی بیٹی سے (نام مذکور نہیں) عبدالرحمانؓ کا نکاح ہوا۔اس سے عبداللہ (بڑا) کی ولادت ہوئی ۔دومۃ الجندل کے حکم ران قبیلہ بنوکلب کے سردار اصبغ کی بیٹی تماضر سے عبدالرحمانؓ کی شادی کسی قریشی کی کلبی عورت سے پہلی شادی تھی ۔اس سے ابوسلمہ (عبداللہ اصغر) کی پیدائش ہوئی ۔ایک اور بیوی اسما بنت سلامہ سے ان کا بیٹا عبدالرحمان جوانھی کے نام سے موسوم ہے متولد ہوا۔یمن کے قبیلہ بہرا سے قید ہو کر عبدالرحمانؓ کے حصہ میں آنے والی لونڈی ام حریث سے ان کے تین بچے مصعب ،آمنہ اور مریم پیدا ہوئے۔بہرا (بہز) ہی سے آنے والی باندی زینت بنت صباح سے ام یحییٰ نے جنم لیا۔ان کی ایک بیوی مجد بنت یزید سے سہیل کی ولادت ہوئی ۔جنگ مدائن میں جو ایرانی سعدؓ بن ابی وقاص کے ہاتھ قید ہو کر آئے ،ان میں ایرانی بادشاہ کسریٰ (خسرو) کی بیٹی غزال بھی تھی ۔یہ عبدالرحمانؓ بن عوف کے حصہ میں آئی اور عثمان کو جنم دیا۔ایک بیٹی جویریہ بادیہ بنت غیلان سے پیدا ہوئی۔عبدالرحمانؓ کی کل اولاد کا شمار: ۲۰ لڑکے اور ۸ لڑکیاں کیا گیا ہے۔

جہاں بے شمار اصحابؓ رسول ﷺ مہندی یا خضاب سے اپنے بالوں کو رنگتے تھے،عبدالرحمانؓ بن عوف اپنا بڑھاپا ہرگز نہ چھپاتے ۔ان کا سر اور ڈاڑھی سفید ہی نظر آتے ۔وہ دراز قد،خوب رو،سرخ وسپید رنگ اور صاف جلد والے تھے،آنکھیں بڑی ،پلکیں گھنی اور ناک بلند تھی ،ہتھیلیاں بڑی اور انگلیاں موٹی تھیں ۔ان کی گردن لمبی ،شانے چوڑے اور کمر میں کچھ جھکاؤ تھا۔عبدالرحمانؓ کے نچلی والے دانت نمایاں نظر آتے تھے،کئی بار ان دانتوں سے ان کے ہونٹ زخمی ہوئے ۔انھیں بائیں ہاتھ سے کام کرنے کی عادت تھی ۔مال دار ہونے کے باوجود ان کا رہن سہن سادہ تھا،اپنے غلاموں کے بیچ کھڑے ہوتے تو پہچاننا مشکل ہوتا۔

حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف کی جلد نازک تھی ،انھیں کھجلی رہتی ، چھالے نکل آتے یا جوئیں پڑ جاتیں اس لیے ریشمی لباس پہنتے تھے ۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انھوں نے اس بات کی اجازت لے رکھی تھی ۔میدان جنگ میں ریشمی لباس پہننے کی اجازت ہر مسلمان کو پہلے ہی تھی ۔انسؓ بن مالک کی روایت ہے،ایک سفر میں عبدالرحمانؓ کو پھنسیاں نکل آئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ریشمی قمیص پہننے کی رخصت دے دی۔ایک دفعہ جوئیں پڑیں تو بھی یہی معاملہ ہوا۔یہ عہد فاروقیؓ کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے معمول کے مطابق ریشمی قمیص پہن کر اپنے بیٹے

ابوسلمہ کے ساتھ باہر نکلے تو حضرت عمرؓ نے اعتراض کیا۔عبدالرحمانؓ نے کہا، کیا آپ کو علم نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے ریشم حلال قرار دیا تھا۔عمرؓ نے فرمایا، آپ ﷺ نے ریشم پہننے کی اجازت اس لیے مرحمت فرمائی تھی کیونکہ تمھیں جوؤں کی شکایت تھی۔ یہ تکلیف زائل ہوئی تو اجازت بھی ختم ہوگئی۔ حضرت زبیرؓ بن عوام کو جوئیں پڑیں تو انھیں بھی ریشمی لباس کی اجازت ملی تھی۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویہ (**ابن ہشام**)، الطبقات الکبری (**ابن سعد**)، المنتظم فی تواریخ الامم والملوک (**ابن جوزی**)، البدایہ والنہایہ (**ابن کثیر**)، تہذیب الکمال فی اسماء الرجال (**مزی**)، سیر اعلام النبلاء (**ذہبی**)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (**ابن عبدالبر**)، الاصابہ فی تمییز الصحابہ (**ابن حجر**)، فتح الباری (**ابن حجر**)، صور من حیاۃ الصحابہ (**عبدالرحمان رافت پاشا**)، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (مقالہ: سعید انصاری)

محمد عمار خان ناصر

مولانا مفتی عبدالواحد کی تنقیدات کا ایک جائزہ

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

''حدود و تعزیرات - چند اہم مباحث'' کے عنوان سے ہماری جو تالیف چند ماہ قبل شائع ہوئی ہے، اہل علم کی طرف سے اس پر مختلف اور متنوع تبصرے سامنے آ رہے ہیں جو علمی وفکری بحثوں میں ایک فطری بات ہے۔ اس ضمن میں دارالافتاء جامعہ مدنیہ لاہور کے صدر جناب ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب نے ''مقام عبرت'' کے نام سے اپنی ایک تحریر میں کتاب کے بعض مباحث کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔ یہ تحریر ماہنامہ 'الشریعہ' میں چھپنے کے علاوہ ایک مستقل کتابچے کی صورت میں بھی شائع کی گئی ہے۔ آیندہ سطور میں ہم مولانا محترم کی اسی تنقید کے حوالے سے اپنی طالب علمانہ گزارشات پیش کریں گے''۔

اس اصولی نکتے کی وضاحت کے بعد اب ہم ان ذیلی تنقیدی نکات کا جائزہ لیں گے جو مولانا محترم نے ہماری آرا کے ضمن میں اٹھائے ہیں۔

دیت کی مقدار

ہم نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ قرآن مجید نے دیت کی کوئی خاص مقدار مقرر نہیں کی، بلکہ اس معاملے کو 'معروف' پر مبنی قرار دیا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ہدایت کی پیروی میں اپنے دور میں دیت کی وہی مقدار یعنی سو اونٹ مقرر فرمائی ہے جو اسلام سے پہلے اہل عرب میں رائج تھی۔ چونکہ معروف سے متعلق دیگر تمام معاملات میں یہ بالکل واضح ہے کہ ہر معاشرہ اپنے ہی معروف کی پیروی کرنے کا پابند ہے نہ کہ عہد نبوی میں اہل عرب کے

معروف کی، اس لیے دیت کی مقدار کی تعیین کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کی حیثیت بھی ابدی تشریع کی نہیں، بلکہ ایک اصولی شرعی حکم کے، وقتی اور زمان ومکان میں محدود اطلاق کی ہے۔

مزید برآں دیت کا قانون جس حکمت پر مبنی ہے، وہ بھی اسی کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کی مقدار اور ادائیگی کے طریقۂ کار وغیرہ امور کو کسی ایک یا چند مخصوص صورتوں میں منجمد کر دینے کے بجائے عرف وعادت اور حالات وزمانہ کے لحاظ سے ان میں تغیر کی گنجایش تسلیم کی جائے۔ یہ بات درست ہے کہ شرعی قوانین کے اطلاق کا مدار اصلاً حکمت پر نہیں، بلکہ علت پر ہوتا ہے، تاہم اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اتنی ہی درست ہے کہ اگر کسی قانون کی حکمت اور مصلحت کا پہلو اس سے مستقل بنیادوں پر منفک ہو جائے تو اس کی ظاہری صورت کو برقرار رکھنے پر اصرار کرنا یقیناً شارع کا منشا نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بات تو صاف لفظوں میں تسلیم کی ہے کہ سو اونٹ دیت کی ابدی شرعی مقدار کی حیثیت نہیں رکھتے، البتہ انھوں نے اس کے بجائے سونے اور چاندی کی مخصوص مقدار کو ابدی شرعی معیار کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

کان اهل الجاهلية قدروها بعشرة من الابل فلما راى عبد المطلب انهم لا ينزجرون بها بلغها الى مائة وابقاها النبى صلى الله عليه وسلم على ذلك لان العرب يومئذ كانوا اهل ابل غير ان النبى صلى الله عليه وسلم عرف ان شرعه لازم للعرب والعجم وسائر الناس وليسو كلهم اهل ابل فقدر من الذهب الف دينار ومن الفضة اثنى عشر الف درهم ومن البقر مائتى بقرة ومن الشاء الفى شاة (حجۃ اللہ البالغہ ۲/۳۹۵)

’’اہل جاہلیت نے دیت کی مقدار دس اونٹ مقرر کی تھی۔ پھر جب عبد المطلب نے دیکھا کہ یہ مقدار لوگوں کو قتل کرنے سے نہیں روک سکتی تو انھوں نے اس کی مقدار سو اونٹ مقرر کر دی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی کو قائم رکھا، کیونکہ اہل عرب اس وقت عام طور پر اونٹوں کے مالک ہوا کرتے تھے۔ تاہم، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی بتایا ہے کہ آپ کی شریعت عرب اور عجم کے تمام انسانوں کے لیے لازم ہے اور چونکہ سب معاشروں میں اونٹ نہیں پائے جاتے، اس لیے آپ نے سونے کے ایک ہزار دینار، چاندی کے بارہ ہزار درہم، دو سو گایوں اور دو ہزار بکریوں کی صورت میں بھی دیت کی مقدار مقرر فرما دی۔‘‘

تاہم شاہ صاحب عرب وعجم کے لیے دیت کی مقدار کے موزوں ہونے کی جس حکمت کے پیش نظر درہم ودینار یا گایوں اور بکریوں کی متعین تعداد کو مستقل شرعی معیار قرار دے رہے ہیں، وہ حکمت پھر بھی قائم نہیں رہتی، اس لیے کہ شاہ صاحب اپنے دور کے تناظر میں غالباً یہ تصور کر رہے ہیں کہ سونے اور چاندی پر مبنی نظام زر ہمیشہ کے لیے قائم رہے گا اور اگر کسی دور میں لوگ اونٹوں کی صورت میں دیت نہ دے سکیں تو سونے اور چاندی کی صورت میں دیت ادا کرنا بہرحال ہر زمانے میں ممکن رہے گا۔ انسانی تمدن کے ارتقا نے واضح کر دیا ہے کہ شاہ صاحب کا یہ مفروضہ درست نہیں، اس لیے کہ دنیا دھاتی زر (Metallic money) کے بعد کاغذی زر (Paper money) کے دور سے گزرتی ہوئی بتدریج اعتباری زر (Credit money) کے دور میں داخل ہوتی جا رہی ہے جس کے نتیجے میں جدید شہری تمدن میں مواشی یا سونے اور چاندی کی صورت میں دیت کی ادائیگی ممکن نہیں رہی۔ چنانچہ درہم ودینار یا گایوں اور بکریوں کی صورت میں مقرر کی جانے والی مذکورہ مقداروں کو اگر شرعی مقداریں مان لیا جائے تو بھی کاغذی کرنسی کو ان کے ساتھ منتھی کرنا ضروری نہیں۔ اس طرح یہ ایک منصوص نہیں، بلکہ اجتہادی معاملہ قرار پاتا ہے۔

اس تناظر میں دیکھیے تو قرآن مجید کی اس ہدایت کی حکمت اور معنویت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اولیاے مقتول کی طرف سے معافی کے فیصلے کے بعد 'اتباع بالمعروف' کیا جائے، یعنی معاشرے کی معقول اور منصفانہ روایات کے مطابق دیت کی رقم مقتول کے وارثوں کو ادا کی جائے۔

اس وضاحت کے بعد اب ان اعتراضات کا جائزہ لیجیے جو مولانا محترم نے ہمارے نقطۂ نظر پر تنقید کرتے ہوئے اٹھائے ہیں:

۱۔ مولانا نے ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریعی حیثیت کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے، جبکہ یہ اعتراض بدیہی طور پر بے بنیاد ہے۔ یہ بات اس صورت میں درست ہو سکتی تھی اگر ہم نے یہ کہا ہوتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سرے سے کوئی تشریعی اختیار ہی نہیں رکھتے، یا یہ کہ اگرچہ آپ نے تو دیت کی مقدار بطور تشریع مقرر کی ہے، لیکن ہم اسے اس حیثیت سے تسلیم نہیں کرتے۔ العیاذ باللہ من ذلک۔ خود مولانا محترم نے ہمارا یہ موقف اپنی تنقید میں نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے تشریعی بھی ہو سکتے ہیں اور قضا وسیاسہ کی نوعیت کے بھی، اور اس کا فیصلہ دلائل وقرائن کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ ہم قرآن مجید کے نصوص کی روشنی میں یہ راے رکھتے ہیں کہ دیت کی مقدار کا معاملہ تشریع کے دائرے سے نہیں، بلکہ سیاسہ کے دائرے سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی یہ نوعیت خود قرآن مجید نے متعین کی ہے۔ اس لیے مولانا محترم کا یہ اعتراض، درحقیقت ایک سنگین الزام کا درجہ رکھتا ہے اور ایسا اگر

اعتراض کا وزن بڑھانے کے لیے دانستہ کیا گیا ہے تو انھیں خدا کے حضور میں اس کی جواب دہی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

۲۔ سورۂ نساء کی آیت ۹۲ میں 'دیة مسلمة الی اهله' کے تحت امام جصاص نے یہ استدلال پیش کیا ہے کہ دیت کا لفظ اپنے مفہوم اور مقدار کے اعتبار سے قرآن کے مخاطبین کے لیے پہلے سے واضح اور معروف تھا، اس لیے جب قرآن مجید نے قتل خطا کی صورت میں 'دیت' ادا کرنے کا حکم دیا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اہل عرب کے ہاں دیت کی جو بھی مقدار معروف ہے، اس کی پیروی کی جائے۔ ہم نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا کہ یہ بات ''عربیت کی رو سے قابل اشکال ہے۔ یہ بات اس کے لغوی مفہوم یعنی ''وہ مال جو خوں بہا کے طور پر ادا کیا جائے'' کی حد تک درست ہے، لیکن اگر اس کی اس مخصوص مقدار کی طرف اشارہ پیش نظر ہوتا جو مخاطب کے نزدیک معروف تھی تو عربیت کی رو سے لفظ 'دیة' کو معرف باللام ہونا چاہیے تھے، کیونکہ اسم نکرہ کسی لفظ کے سادہ لغوی مفہوم سے بڑھ کر اس کے کسی مخصوص و متعین مصداق پر دلالت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ قرآن مجید کا یہاں لفظ 'دیة' کو نکرہ لانا درحقیقت اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اس کی کسی مخصوص مقدار کی تعیین یا اس کی طرف اشارہ سرے سے اس کے پیش نظر ہی نہیں ہے۔''

مولانا محترم نے اس کے جواب میں فرمایا ہے کہ:

''محمد عمار صاحب کا جصاص رحمہ اللہ پر اعتراض بے بنیاد ہے کیونکہ:

۱۔ نکرہ کبھی تعظیم کے لیے ہوتا ہے، اس لیے دیة سے مراد ہے وہ بڑی اور عظیم رقم جو خون بہا کے طور پر دی جائے اور چونکہ وہ رقم معاشرے میں متعین اور مروج تھی، اس لیے جصاص رحمہ اللہ نے اس کو متعین مقدار سے تعبیر کیا۔

۲۔ عرب معاشرے میں دیت کی صرف ایک مقدار متعین نہیں تھی بلکہ مردوں کی علیحدہ مقدار تھی اور عورتوں کی علیحدہ مقدار تھی۔ دیت کی مقدار معلوم ہونے کے باوجود چونکہ اس میں تعدد تھا اس لیے دیة کو نکرہ لائے۔'' (مقام عبرت، ص ۲۰)

مولانا محترم کا یہ استدلال کئی وجوہ سے محل نظر ہے۔ اول تو یہاں نکرہ کو تعظیم کے لیے ماننے کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔ بالفرض یہ تعظیم کے لیے ہو تو بھی اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ دیت کے طور پر ایک بڑی رقم ادا کی جائے۔ یہ بات کہ وہ بڑی رقم متعین اور معہود ہے، اس سے پھر بھی ثابت نہیں ہوتی۔ اسی طرح یہ نکتہ کہ چونکہ مرد و عورت کی دیت کی الگ الگ مقدار رائج تھی، اس لیے 'دیة' کے لفظ کو معرفہ لانا مناسب نہیں تھا، یہ بھی اسی صورت میں برمحل ہو سکتا ہے جب پہلے یہ فرض کر

لیا جائے کہ قرآن کسی مخصوص مقدار ہی کی پابندی کو لازم قرار دینا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے کوئی الگ دلیل چاہیے جو موجود نہیں۔ ان سب موانع سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ مان لیا جائے کہ یہاں دیت کی کسی پہلے سے طے شدہ مقدار ہی کی طرف اشارہ ہے تو بھی اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن نے دیت کے طور پر اہل عرب کے عرف میں رائج مقدار ادا کرنے کی ہدایت کی ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ اس مقدار کو ابدی شرعی معیار کے طور پر لازم کرنا چاہتا ہے تو اس کے اثبات کے لیے یہ نکتہ کافی نہیں، بلکہ کوئی زائد دلیل درکار ہے۔ ہمارے نزدیک چونکہ قرآن نے دوسرے مقام پر 'فاتباع بالمعروف' (البقرہ ۲:۱۷۸) کے الفاظ میں اس کی تصریح کر دی ہے کہ اس باب میں اصل معیار کی حیثیت 'معروف' کو حاصل ہے، اس لیے اہل عرب کے معروف کی پابندی تا قیامت سارے انسانی معاشروں کے لیے لازم قرار نہیں دی جا سکتی۔

۳۔ مولانا محترم نے دیت کی مذکورہ مقدار کے ابدی طور پر لازم ہونے پر یہ دلیل بھی پیش کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم بیان کرتے ہوئے 'من قتل خطا فدیته مائة من الابل' (جو شخص بلا ارادہ قتل ہو جائے، اس کی دیت سو اونٹ ہے) کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور چونکہ ''اس حدیث میں 'من' عموم کا کلمہ ہے جو زمان و مکان کی قید سے خالی ہے، لہٰذا یہ حکم ہر زمان و مکان کے لیے ہوگا۔'' (مقام عبرت، ص ۱۷)

اصول فقہ کی درسی کتابوں میں 'من' اور 'ما' کے عموم کے بارے میں عام طور پر جو کچھ بتایا جاتا ہے، اس کے حد تک مولانا محترم کا یہ استدلال درست ہے، تاہم فقہا اپنے استنباطات میں عملی طور پر اس نوعیت کے ظاہری عموم کو کوئی حتمی اور فیصلہ کن دلیل نہیں سمجھتے، اور ان کے ہاں دوسرے شرعی و عقلی دلائل کی روشنی میں اس کی تحدید و تخصیص کی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر کتب حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ 'من قتل قتیلا له علیه بینة فله سلبه' (بخاری، رقم ۲۹۰۹) یعنی میدان جنگ میں جس شخص نے دشمن گروہ کے جس سپاہی کو قتل کیا ہو اور اس کے پاس اس کا ثبوت بھی موجود ہو، اس سے چھینا ہوا سامان مشترکہ مال غنیمت کا حصہ نہیں، بلکہ خاص طور پر قاتل ہی کا حق ہوگا۔ جمہور فقہا اس ارشاد کو عمومی تشریع پر محمول کرتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ایک عام قاعدے کی حیثیت سے بیان فرمائی ہے، تاہم فقہاے احناف نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ بات کوئی عام ضابطہ نہیں، بلکہ ہر ہر جنگ کے موقع پر امیر لشکر کے صواب دیدی اختیار پر موقوف ہے۔ احناف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیصلے کو بھی صرف اس خاص جنگ کی حد تک موثر سمجھتے ہیں جس میں

آپ نے اس کا اعلان فرمایا۔ یہاں دیکھ لیجیے، حدیث میں 'مِن' کا لفظ آنے کے باوجود احناف اس حکم کو ابدی طور پر ہر زمان ومکان کے لیے تو کجا، خود عہد نبوی کی دوسری جنگوں کے لیے بھی عام تسلیم نہیں کرتے۔ اسی اصول پر ہمارا کہنا یہ ہے کہ اگر قرآن نے اصولی طور پر دیت کی مقدار وغیرہ معاملات کو ہر معاشرے کے معروف پر منحصر قرار دیا ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا 'مِن' کے لفظ سے اس کی ایک مخصوص مقدار کو بیان کرنا اہل عرب کے عرف پر مبنی اور اسی دائرے میں محدود ہے۔ کسی واضح مستقل دلیل کے بغیر اسے ابدی شرعی حکم قرار نہیں دیا جا سکتا۔

مرد اور عورت کی دیت میں فرق

۴۔ ہم نے لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول مستند ارشادات یا فیصلوں میں کہیں بھی مرد اور عورت کی دیت کے مابین تفریق نہیں کی گئی، بلکہ ہر جگہ کسی فرق کے بغیر انسانی جان کی دیت سو اونٹ ہی بیان کی گئی ہے اور یہ کہ اس ضمن میں جو بعض روایات آپ کی طرف منسوب کی گئی ہیں، وہ سب کی سب ضعیف ہیں۔ البتہ، صحابہ اور تابعین کے فیصلوں میں اس فرق کا ذکر ملتا ہے۔ ہم نے گزارش کی ہے کہ ان فیصلوں کو بھی اہل عرب کے عرف اور انھی کے معاشرتی تصورات پر مبنی سمجھنا چاہیے، کیونکہ نہ قرآن مجید نے انسانی حیثیت میں مرد اور عورت کے مابین کوئی فرق کیا ہے اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی اس تصور کی کوئی تائید کی ہے۔

مولانا محترم نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے دو نکتے اٹھائے ہیں: ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب احادیث کی سند اگرچہ ضعیف ہے، لیکن صحابہ وتابعین کے عمل سے ان کی تائید ہوتی ہے، اس لیے یہ روایات قابل استدلال ہیں، اور دوسرا یہ کہ صحابہ کے فتاویٰ بھی چونکہ 'مقادیر' سے متعلق ہیں، اس لیے یہ صحابہ کے اجتہاد پر نہیں، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع پر مبنی ہیں اور ان کا حکم بھی مرفوع احادیث کا ہے۔ (مقام عبرت، ص ۲۲، ۲۳)

پہلے نکتے کے جواب میں ہماری گزارش یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مذکورہ ضعیف احادیث کی نسبت کو درست ماننے میں ایک مضبوط مانع پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ آپ سے منقول مستند ارشادات میں مرد اور عورت میں کسی فرق کے بغیر دیت کی مقدار ایک ہی بیان کی گئی ہے۔ ہم نے اس ضمن میں دیت سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ہدایات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے جو آپ نے یمن کے گورنر عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو لکھ کر دیں اور جن میں کسی فرق کے بغیر قتل خطا کی دیت مطلقاً سو اونٹ ہی بیان کی گئی ہے۔ اس سے استدلال کرتے ہوئے ہم نے لکھا ہے کہ ''یہ ہدایات ایک باقاعدہ سرکاری دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں اور قتل یا جراحات کے باب میں مرد اور عورت کی

دیت میں شرعی طور پر فرق موجود ہونے کی صورت میں یہاں اس کا ذکر نہ کرنا کسی طرح قابل فہم نہیں۔'' گویا نہ صرف یہ کہ مرد و عورت کی دیت میں فرق کا ذکر کرنے والی روایات سنداً ناقابل اعتبار ہیں، بلکہ ان کے مقابلے میں مستند اور صحیح احادیث اس فرق کی نفی پر دلالت کرتی ہیں۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ پھر اس مفہوم کی روایات کیا وضع کی گئی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی حدیث کو ضعیف کہنے کا مطلب لازماً اس کو موضوع قرار دینا نہیں ہوتا، کیونکہ بعض دفعہ متن تو فی نفسہ ثابت ہوتا ہے، لیکن اس کی نسبت میں راویوں سے غلطی ہو جاتی ہے۔ زیر بحث روایات کے بارے میں بھی ہماری راے یہ ہے کہ ان میں صحابہ کے فتووں کو غلطی سے مرفوعاً بیان کر دیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ فقہا یا محدثین اس فرق کو بیان کرتے ہوئے مرفوع روایات کو ماخذ استدلال نہیں بناتے، بلکہ اس کے حق میں صحابہ کے فتاویٰ ہی کو پیش کرتے ہیں۔

دوسرے نکتے کے جواب میں ہم مولانا محترم کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہیں گے کہ خلاف قیاس امور میں صحابہ کی آرا کو سماع پر محمول کرنے کا اصول علمی و عقلی طور پر اسی صورت میں لاگو ہونا چاہیے جب دلائل و قرائن کی روشنی میں دوسرے تمام ممکنہ مآخذ کی نفی ہو جائے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی صحابی اہل کتاب سے بھی روایت کرتے ہوں تو محدثین، سابقہ زمانوں سے متعلق ان کی نقل کردہ روایت کو 'مرفوع' قرار نہیں دیتے، کیونکہ اس بات کا امکان پایا جاتا ہے کہ انھوں نے وہ بات اہل کتاب سے سنی ہو۔ ہمارے نزدیک زیر بحث مسئلے میں بھی اس نکتے کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ چونکہ اہل عرب کے عرف میں مرد اور عورت کی دیت میں فرق پہلے سے رائج تھا، اس لیے اس امکان کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ صحابہ نے اسی کی رعایت کرتے ہوئے، نہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع کی بنیاد پر، عورت کے لیے آدھی دیت کے فیصلے فرمائے ہوں۔ اس بات کا وزن اس تناظر میں بالخصوص نمایاں ہو جاتا ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مستند ارشادات سے جو راہنمائی حاصل ہوتی ہے، وہ مرد و عورت کی دیت میں فرق کے حق میں نہیں بلکہ اس کے خلاف ہے۔ اس صورت حال میں صحابہ کے فتاویٰ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کے بجائے اس سوال پر غور کرنا چاہیے کہ:

> ''اگر قرآن نے اس تصور کی تائید نہیں کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو سند جواز عطا نہیں کی تو اس پر مبنی ایک قانون کو چاہے وہ اہل عرب کے معروف اور دستور ہی کی صورت کیوں نہ اختیار کر چکا ہو، صحابہ اور تابعین کے ہاں کیوں پذیرائی حاصل ہوئی؟ کیا اس سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اگرچہ عورت کے بارے میں جاہلی معاشرت کے بہت سے تصورات اور رسوم کی اصلاح کر دی گئی، تاہم بعض تصورات ...... جن میں عورت کی جان کی حرمت اور

قدر و قیمت کے حوالے سے زیر بحث تصور بھی شامل ہے۔ کی اصلاح کی کوششیں نتیجہ خیز اور موثر نہ ہو سکیں اور صحابہ و تابعین کو معروضی معاشرتی تناظر میں ایسے قوانین تجویز کرنا پڑے جن میں انھی سابقہ تصورات کی عملی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہو؟'' (حدود و تعزیرات، ص ۱۰۴، ۱۰۵)

مولانا محترم نے ہمارے اٹھائے ہوئے اس سوال پر اعتراض کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''محمد عمار صاحب نے غور نہیں کیا کہ اس الزام اور اعتراض کی زد کس پر پڑ رہی ہے۔ یہ زد پڑ رہی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور صحابہ رضی اللہ عنہم پر کہ صحابہ اپنے میں سے جاہلی معاشرت کے اس تصور کو دور نہ کر سکے اور اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بھی کوشش کی ہوگی، وہ سب غیر موثر اور بے نتیجہ رہی۔'' (مقام عبرت، ص ۲۴)

مولانا محترم کے اس ارشاد سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری محض یہ نہیں تھی کہ آپ جاہلیت کے غلط تصورات کو دین و شریعت کے دائرے میں اصولی طور پر واضح فرما دیں اور حتی الامکان ان کی اصلاح کی کوشش کریں، بلکہ آپ اس بات کے بھی مکلّف تھے کہ ان تمام تصورات کو عملاً معاشرے سے پوری طرح ختم کر دیں۔ اگر ان کی بات کا مطلب یہی ہے تو ہم طالب علمانہ طور پر ان سے یہ سمجھنا چاہیں گے کہ قرآن وسنت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس مفروضہ ذمہ داری کا ماخذ کیا ہے اور وہ کون سے دلائل ہیں جن کی بنا پر اس ہدف کے حاصل نہ ہونے کو آپ کے حق میں 'الزام' اور 'اعتراض' قرار دیا جا رہا ہے؟ پھر اس سوال کا جواب بھی مولانا محترم کے ذمے ہے کہ کیا فی الواقع نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب معاشرے سے جاہلیت کے تمام تصورات اور رسوم کا عملی سطح پر کلیتاً خاتمہ کر دیا تھا؟ مثال کے طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص کے مرنے پر نوحہ کرنے کو جاہلیت کا طریقہ قرار دیا (بخاری، رقم ۳۵۶۱) اور فرمایا کہ جس جنازے کے ساتھ کوئی نوحہ کرنے والی ہو، اس کے ساتھ نہ قبرستان نہ جایا جائے۔ (مسند احمد، رقم ۵۴۱۰) آپ نے نوحہ کرنے والی عورت پر لعنت فرمائی (ابن ماجہ، رقم ۱۵۷۴) اور یہ وعید بھی بیان فرمائی کہ اگر ایسی عورت توبہ کیے بغیر مر جائے گی تو قیامت کے دن اسے قطران اور جرب کا لباس پہنایا جائے گا۔ (مسلم، رقم ۱۵۵۰) لیکن آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جاہلیت کے چار کام ایسے ہیں جنھیں میری امت نہیں چھوڑے گی اور ان میں سے ایک نوحہ کرنا بھی ہے۔ (مسلم، رقم ۱۵۵۰) ایک موقع پر آپ نے خواتین سے بیعت لیتے وقت نوحہ نہ کرنے کا وعدہ لینا چاہا تو ایک خاتون نے کہا کہ یا رسول اللہ، مجھے صرف فلاں خاندان کے لیے نوحہ کرنے کی اجازت دے دیجیے، کیونکہ انھوں نے زمانہ جاہلیت میں میرے چچا کے مرنے پر نوحہ کرنے میں میرا

ساتھ دیا تھا اور میں ان کا بدلہ اتارنا چاہتی ہوں۔ آپ نے ابتدا میں اس کی اجازت نہیں دی، لیکن اس کے بار بار اصرار پر فرمایا کہ اچھا، 'الا آل فلان'، یعنی ٹھیک ہے، ان کے لیے نوحہ کرسکتی ہو۔ (مسلم، رقم ۱۵۵۴۔ ترمذی، رقم ۳۲۲۹) دوسری روایت کے مطابق آپ نے کہا کہ جاؤ، پہلے اس کا بدلہ اتارلو، پھر بیعت کر لینا۔ چنانچہ وہ خاتون چلی گئی اور بعد میں دوبارہ آ کر بیعت کی۔ (نسائی، رقم ۴۱۰۸) جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر مدینہ پہنچی تو ان کے خاندان کی عورتیں ان کے گھر میں جمع ہوگئیں اور نوحہ کرنا شروع کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ پیغام بھیج کر انھیں اس سے منع کیا، لیکن وہ باز نہ آئیں۔ آپ نے دوبارہ پیغام بھیجا، لیکن وہ باز نہ آئیں۔ آپ نے تیسری مرتبہ پیغام بھیجا تو بھی وہ نہ رکیں اور قاصد نے آ کر کہا کہ 'واللہ لقد غلبننا یا رسول الله'، یعنی وہ ہمارے قابو میں نہیں آ رہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ 'فاحث فی افواھھن التراب' یعنی پھر ان کے مونہوں میں مٹی بھر دو۔ (بخاری، رقم ۱۲۱۶) ام عطیہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خواتین سے بیعت لیتے وقت ان سے یہ عہد بھی لیتے تھے کہ وہ نوحہ نہیں کریں گی، لیکن پانچ خواتین کے علاوہ کوئی اپنے عہد پر قائم نہیں رہی۔ (بخاری، رقم ۱۲۲۳) سیدنا ابوبکر کا انتقال ہوا تو ام المومنین عائشہ کے حجرے میں مہاجرین اور انصار کی خواتین نوحہ کرنے کے لیے جمع ہوگئیں۔ سیدنا عمر کو اطلاع ہوئی تو وہ تشریف لائے اور خواتین کو اس سے روکا، لیکن وہ نہ رکیں۔ اس پر ہشام بن ولید، ام المومنین کے اجازت نہ دینے کے باوجود، سیدنا عمر کے حکم پر ان کے حجرے میں داخل ہوئے اور ایک ایک کر کے سب خواتین کو باہر نکالا اور انھیں درے لگائے۔ (ابن سعد، الطبقات الکبریٰ ۳/۲۰۸، ۲۰۹۔ طبری، تاریخ الامم والملوک ۲/۳۴۹، ۳۵۰۔ ابن حجر، الاصابہ، ۶/۵۴۴)

اگر مولانا محترم کا دعویٰ وہی ہے جو ان کے اعتراض سے مترشح ہوتا ہے تو پھر وہ اس معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی کوششوں کے بے نتیجہ اور غیر موثر رہنے کی کیا توجیہ فرمائیں گے؟

۵۔ ہم نے لکھا ہے کہ مرد اور عورت کی دیت میں تفریق اس کے بغیر ممکن نہیں کہ خود انسانی حیثیت میں عورت کے وجود کو مرد سے فروتر اور اس کی جان کو مرد کے مقابلے میں کم قیمت قرار دیا جائے اور اہل علم نے بالعموم اس فرق کی بنیاد اسی نکتے کو قرار دیا ہے۔ مثال کے طور پر ابن القیم لکھتے ہیں کہ مرد، عورت کے مقابلے میں انسانی معاشرت اور تمدن کے لیے زیادہ نفع بخش کردار ادا کرتا ہے اور اجتماعی زندگی کی جن ذمہ داریوں، مثلاً دینی مناصب، حکومت واقتدار، جنگ و پیکار، کھیتی باڑی، صنعت وحرفت اور جان ومال کی محافظت وغیرہ سے مرد عہدہ برآ ہوسکتا ہے، عورت

نہیں ہوسکتی، اس لیے عورت کی جان کی قیمت بھی مرد کی جان کے برابر نہیں ہوسکتی اور اسی لیے اس کی دیت بھی نصف رکھی گئی ہے۔ ہم نے اس استدلال پر تنقید کرتے ہوئے گزارش کی ہے کہ اگر عورت کی جان مرد کے مقابلے میں کم تر قیمت کی حامل ہے تو پھر قتل کی صورت میں مرد اور عورت کے باہمی قصاص کے معاملے میں اس فرق اور تفاوت کو کیوں نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اگر کوئی مرد کسی عورت کو قتل کر دے تو جواب میں اسے کیوں قتل کیا جاتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں مرد کا عورت کے قصاص میں قتل کیا جانا اس امر کی صریح دلیل ہے کہ شارع کے نزدیک دونوں کی جان کی قیمت ایک جیسی ہے، چنانچہ اگر قصاص کے معاملے میں مرد اور عورت کے مابین کوئی فرق نہیں تو دیت کی مقدار کے معاملے میں بھی کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے قصاص کے معاملے میں کوئی فرق نہ کرنے جبکہ دیت کی مقدار میں فرق کرنے کی توجیہ یہ کی ہے کہ یہاں دراصل دو متعارض قیاس کام کر رہے ہیں۔ ایک طرف مرد کو عورت پر حاصل فضیلت اور اس کی قوامیت کا تقاضا یہ ہے کہ مرد سے عورت کا قصاص نہ لیا جائے، لیکن دوسری طرف دونوں کے انسان ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ قصاص لیا جائے، اس لیے ان دونوں قیاسوں کے مابین یوں تطبیق دی گئی ہے کہ قصاص کے معاملے میں تو دونوں کی یکساں انسانی حیثیت کا لحاظ رکھا جائے، جبکہ دیت کے معاملے میں مرد کی فضیلت کے پیش نظر عورت کی دیت میں کمی کر دی جائے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ۲/۳۹۲) لیکن بدیہی طور پر یہ توجیہ اطمینان بخش نہیں، کیونکہ قصاص اور دیت کا تعلق انسانی جان پر تعدی سے ہے اور خود شاہ صاحب یہ تسلیم کر رہے ہیں کہ انسان ہونے کی حیثیت میں مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں، چنانچہ مرد کو بعض دوسرے پہلوؤں سے جو فضیلت حاصل ہے، اسے انسانی جان کی حرمت اور اس پر تعدی سے متعلق قوانین کے دائرے میں موثر ماننے کی کوئی ضرورت نہیں۔

بہر حال مرد و عورت کی دیت میں فرق کی روایتی عقلی توجیہ پر وارد ہونے والے اعتراضات کا وزن محسوس کرتے مولانا محترم نے ایک مختلف اور دلچسپ استدلال پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''عورت میں ایک حیثیت ہے جبکہ مرد میں دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت جو مرد و عورت دونوں میں یکساں طور پر مشترک ہے، وہ انسانی جان کی ہے۔ اس کے اعتبار سے مرد اور عورت دیت میں بھی برابر ہیں اور قتل کی صورت میں قصاص میں بھی برابر ہیں۔ دوسری حیثیت جو صرف مرد کو حاصل ہے، عورت کو نہیں، وہ اس کی معاشی ذمہ داری کی ہے۔ شریعت نے عورت کو اپنا خرچہ خود کمانے کا بھی مکلّف نہیں بنایا ہے جبکہ مرد پر عام حالات میں عورتوں اور نابالغ بچوں کے خرچے رکھے ہیں۔ اس حیثیت کی وجہ سے مرد کی دیت کو دگنا کیا گیا ہے۔'' (ص ۲۵)

دوسرے لفظوں میں مولانا محترم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عورت کی دیت آدھی نہیں، بلکہ مرد کی دوگنی ہے اور یہ اضافی دیت اس کے انسانی حیثیت میں عورت سے اشرف ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ ان عملی ذمہ داریوں کی وجہ سے ہے جو وہ خاندان کے تحفظ اور اس کی بقا کے لیے زائد طور پر انجام دیتا ہے۔

تاہم مولانا محترم کی یہ بات اول تو 'توجیه القول بما لا یرضی به قائله' کے زمرے میں آتی ہے، اس لیے کہ فقہا بالاتفاق اس فرق کی وجہ عورت کی جان کی انسانی قدر و قیمت کا مرد سے کم تر ہونا ہی بیان کرتے ہیں اور اسی وجہ سے فقہاے احناف کا موقف یہ ہے کہ اگر مرد، عورت کے کسی عضو کو ضائع کر دے تو مرد اور عورت کے مابین مساوات نہ ہونے کی وجہ سے اس سے قصاص نہیں لیا جا سکتا۔ چنانچہ یہاں مولانا محترم سے یہ سوال کرنے کو جی چاہتا ہے کہ وہ اس فرق کی توجیہ کے لیے سلف سے مختلف نقطۂ نظر اختیار کرنے کی جسارت کیوں کر رہے ہیں؟ کیا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ماضی کے تمام علما و فقہا کی سمجھ میں تو یہ بات نہ آ سکی اور وہ عورت کو انسانی حیثیت میں مرد سے کم تر قرار دینے کی ''گمراہی'' میں مبتلا رہے، جبکہ اس نکتے کو دریافت کرنے کا شرف چودہ صدیوں کے بعد پہلی مرتبہ مولانا محترم ہی کے ذہن رسا کے حصے میں آیا؟

مولانا کی اس توجیہ میں مرد کی مذکورہ ذمہ داری کا دیت کی مقدار کے ساتھ تعلق بھی واضح نہیں۔ اگر مولانا کی مراد یہ ہے کہ دیت کی رقم، مقتول کے مرنے سے اس کے ورثا کو لاحق ہونے والے معاشی نقصان کی تلافی کے لیے دی جاتی ہے اور یہ معاشی نقصان مرد کی موت کی صورت میں زیادہ ہوتا ہے تو پھر اس فرق کو جوان اور کمانے والے مرد تک محدود رکھنا چاہیے جبکہ نابالغ لڑکوں، اور اپنی اولاد پر منحصر بوڑھے باپ کی دیت وہی ہونی چاہیے جو عورت کی ہے۔ پھر یہ کہ فی نفسہ انسانی جان کی قیمت کے علاوہ معاشی نقصان کا پہلو صرف مرد کی موت کے ساتھ نہیں، بلکہ بعض پہلوؤں سے عورت کی موت کے ساتھ بھی وابستہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر وہ کسی کی بیوی تھی تو شادی بیاہ کے جو اخراجات اس کے والدین اور اس کے شوہر نے کیے ہوں، وہ ضائع ہو جاتے ہیں اور نئی شادی کے لیے مرد کو نئے اخراجات کرنے پڑتے ہیں۔ اسی طرح اگر وہ چھوٹے بچوں کی ماں تھی تو اب ان کی پرورش اور نگہداشت کے لیے بھی باپ کو متبادل انتظامات کرنے ہوں گے۔ چنانچہ معاشی نقصان کا پہلو جس طرح مرد کی موت کی صورت میں پایا جاتا ہے، اسی طرح عورت کی موت کو بھی اس سے کلیتاً منفک نہیں کیا جا سکتا۔

مزید برآں دیت میں اضافے کے لیے گھر سے باہر کی معاشی ذمہ داری کے پہلو کو ملحوظ رکھنے اور گھر کے اندر کی ذمہ داریوں کو نظر انداز کرنے کی بھی کوئی معقول وجہ نہیں۔ اگر عملی زندگی میں معاشی ذمہ داری کا بوجھ اٹھا کر مرد ایک

ایسا کردار ادا کرتا ہے جو بالعموم عورت نہیں کرتی تو اس کے مقابلے میں بچوں کو جنم دینے اور ان کی پرورش کی صورت میں عورت بھی ایک ایسا کردار ادا کرتی ہے جس کی مرد سرے سے صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ چنانچہ اگر مرد کے ایک اضافی عملی کردار کی وجہ سے اس کی دیت میں اضافہ کرنا مناسب ہے تو عورت کی دیت کی مقدار مقرر کرتے ہوئے اس کے مخصوص اضافی کردار کو نظر انداز کرنے کا کیا جواز ہے، جبکہ انسانی زندگی کی بقا اور انسانی معاشرت کے تسلسل کے تناظر میں دونوں یکساں درجے کی اہمیت رکھتے ہیں؟

یہاں یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ مرد و عورت کی دیت میں فرق کے مسئلے پر معروف معنوں میں بھی کوئی اجماع نہیں پایا جاتا، اس لیے کہ صدر اول کے دو معروف اصحاب علم یعنی ابوبکر الاصم اور ابن علیہ اس فرق کے قائل نہیں اور فقہ حنبلی کی مستند کتاب 'کشاف القناع' کے مصنف نے اسی بنیاد پر اس مسئلے پر اجماع کے دعوے کو قبول نہیں کیا (کشاف القناع ۲۰/۲۴۵) جبکہ امام رازی نے ابوبکر الاصم اور ابن علیہ کے نقطۂ نظر کو جس اسلوب میں بیان کیا ہے، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ بھی اس کے حق میں رجحان رکھتے یا کم از کم اسے قابل غور ضرور سمجھتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

مذهب اكثر الفقهاء ان دية المراة نصف دية الرجل وقال الاصم وابن علية ديتها مثل دية الرجل۔ حجة الفقهاء ان عليا وعمر وابن مسعود قضوا بذلك ولان المراة فى الميراث والشهادة على النصف من الرجل فكذلك فى الدية وحجة الاصم قوله تعالىٰ ومن قتل مومنا خطا فتحرير رقبة مومنة ودية مسلمة الى اهله واجمعوا على ان هذه الآية دخل فيها حكم الرجل والمراة فوجب ان يكون الحكم فيها ثابتا بالسوية والله اعلم۔

''اکثر فقہا کا مذہب یہ ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کے نصف ہے، جبکہ اصم اور ابن علیہ کا کہنا ہے کہ عورت کی دیت مرد کے برابر ہے۔ فقہا کی دلیل یہ ہے کہ سیدنا علی، سیدنا عمر اور سیدنا ابن مسعود نے اپنے فیصلوں میں عورت کی آدھی دیت دلوائی ہے۔ مزید یہ کہ عورت کی گواہی اور وراثت میں اس کا حصہ مرد سے آدھا ہے، اس لیے اس کی دیت بھی آدھی ہونی چاہیے۔ اصم کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ 'ومن قتل مومنا خطا فتحرير رقبة مومنة ودية مسلمة الى اهله'۔ اس پر اتفاق ہے کہ اس آیت میں مرد اور عورت، دونوں کی دیت کا حکم بیان ہوا ہے (اور چونکہ مقدار میں کسی فرق کا ذکر نہیں ہوا) اس لیے لازم ہے کہ اس کا حکم دونوں کے لیے ایک جیسا ہو۔

(التفسیر الکبیر ۵/۳۳۵) واللہ اعلم۔‘‘

اسی طرح فقہ وقانون کے فاضل عراقی عالم الدکتور صلاح الدین الناہی نے معروف حنفی فقیہ ابواللیث سمرقندی کی کتاب ’’خزانۃ الفقہ‘‘ کے حاشیے میں اس مسئلے کو ایک قیاسی مسئلہ قرار دیا اور عرف میں تبدیلی کی بنیاد پر فقہا کی رائے کو قابل نظر ثانی قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

سند الفقه في ذلك القياس على نصيب المراة في الميراث و كونه نصف ميراث الرجل وفي الشهادة وهذا قياس مقبول في زمانهم اما في زماننا هذا فهو قياس مع الفارق لان الدية تعويض للمجني عليه من جناية وليست ميراثا وفي التعويض عن الضرر تستوي المراة والرجل كما ان اعراف زماننا هذه سائرة نحو المساواة بين الرجل والمراة في المراكز بحيث يمكن القول ان جراحات النساء واروشهن في زماننا هذا ينبغي ان تكون مثل جراحات الرجال واروشهم ودياتهم (ہامش ’’خزانۃ الفقہ‘‘، ۱/۳۶۴)

’’فقہا اس مسئلے کو وراثت میں عورت کے نصف حصے اوراس کی آدھی گواہی پر قیاس کرتے ہیں۔ یہ قیاس ان کے زمانے میں قابل قبول تھا، لیکن ہمارے زمانے میں یہ قیاس مع الفارق ہے، کیونکہ یہ وراثت کا معاملہ نہیں، بلکہ دیت کی صورت میں مظلوم کو اس پر ہونے والے ظلم کا عوض دلایا جاتا ہے، اور ضرر کا عوض دلائے جانے میں مرد اور عورت مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے زمانے کے عرف کا رجحان مراکز (؟) میں مرد اور عورت کو برابر تسلیم کرنے کی طرف ہے، چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے زمانے میں خواتین کی جراحات اور دیت کو مقدار کے اعتبار سے مردوں ہی کی جراحات اور دیت کے برابر ہونا چاہیے۔‘‘

خود ہمارے ہاں قصاص ودیت سے متعلق نافذ کیے جانے والے قوانین میں مرد اور عورت کی دیت میں فرق کو تسلیم نہیں کیا گیا اور کسی امتیاز کے بغیر دیت کی کم ازکم مقدار ۳۰۶۳۰ گرام چاندی مقرر کی گئی ہے۔

زنا کی سزا

اب آیئے ان اعتراضات کی طرف جو زنا کی سزا سے متعلق نصوص کی تاویل وتفسیر کے ضمن میں مولانا محترم نے ہماری راے پر وارد کیے ہیں۔ یہاں بنیادی طور پر دو نکتے زیر بحث ہیں:

ایک یہ کہ سورۂ نساء کی آیات ۱۵، ۱۶ میں 'و اللاتی یاتین الفاحشة' اور 'و الذان یاتیانها' کا مصداق کون سے زانی ہیں اور پہلی آیت میں خواتین کو الگ ذکر کر کے ان کی سزا الگ بیان کرنے کی وجہ کیا ہے؟

دوسرا یہ کہ قرآن مجید میں زانی مرد وعورت کی سزا، شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کے فرق کے بغیر، مطلقاً سو کوڑے بیان کیے جانے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول احادیث میں ازدواجی حیثیت کے اعتبار سے مجرموں میں فرق کرتے ہوئے شادی شدہ مجرموں پر رجم کی سزا نافذ کرنے کے مابین بظاہر جو تعارض دکھائی دیتا ہے، اس کی توجیہ کیا کی جا سکتی ہے؟

پہلے نکتے کے ضمن میں ہم نے آیات کے داخلی قرائن کی روشنی میں اس راے کو ترجیح دی ہے کہ یہاں زنا کا اتفاقیہ ارتکاب کرنے والے عام مجرم نہیں، بلکہ اس کو پیشہ اور عادت کے طور پر اختیار کر لینے والے مجرم زیر بحث ہیں اور قرآن نے پہلی آیت میں پیشہ ور بدکار عورتوں کی سرگرمیوں کی روک تھام کی تدبیر بیان کی جبکہ دوسری آیت میں یاری آشنائی کا مستقل تعلق قائم کر لینے والے جوڑوں کی تادیب وتنبیہ کا طریقہ بیان فرمایا ہے۔ ہم نے اس آیت کو اس نوعیت کے مجرموں سے متعلق قرار دینے کے لیے آیات سے دو قرینے پیش کیے ہیں۔ ایک یہ کہ آیت ۱۶ میں زانی مرد وعورت کو اذیت دینے کا حکم بیان کرنے کے بعد یہ ہدایت کی گئی ہے کہ 'فان تابا و اصلحا فاعرضوا عنهما'، یعنی اگر وہ توبہ اور صلاح کی روش اختیار کریں تو ان سے درگزر کیا جائے جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن انھیں سزا دے دینے کے بعد بھی ان کی روش پر نظر رکھنے کا حکم دے رہا ہے اور یہ کہہ رہا ہے کہ ان سے اعراض کا طریقہ اسی وقت اختیار کیا جائے جب وہ توبہ اور اصلاح کر لیں۔ یہ اس امر کا صاف قرینہ ہے کہ مذکورہ مرد وعورت کے مابین مستقل یاری آشنائی کا تعلق ہے، کیونکہ اگر یہ اتفاقیہ زنا کا مرتکب جوڑا ہو تو انھیں اس پر ایک مرتبہ سزا دے دینا کافی ہے اور اس کے بعد ان کی روش پر مستقل نظر رکھنے کی ضرورت نہیں۔ دوسرا یہ کہ اسی ہدایت کے متصل بعد اللہ تعالیٰ نے توبہ کے حوالے سے اپنا یہ قانون بیان کیا ہے کہ جو مجرم جذبات کے غلبے میں گناہ کے مرتکب ہوں اور پھر فوراً نادم ہو کر توبہ کر لیں، ان کی توبہ اللہ تعالیٰ ضرور قبول کرتے ہیں، لیکن جو گناہوں کو مستقل روش کے طور پر اختیار کر لیں اور توبہ کا خیال انھیں موت کو دیکھ کر ہی آئے، ان کی توبہ قبول کرنا اللہ کے ذمے نہیں۔ یہاں یہ تنبیہ بھی اس صورت

میں زیادہ برمحل لگتی ہے جب پیچھے زنا کے عادی مجرموں کو موضوع بحث مانا جائے۔

مولانا محترم نے ہماری اس رائے پر تنقید کرتے ہوئے مذکورہ دونوں قرائن سے تو کوئی تعرض نہیں کیا، البتہ یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ اس توجیہ کو ماننے کی صورت میں یہ تصور کرنا پڑے گا کہ ''ایک انتہائی صالح مسلمان معاشرہ میں جس کی تربیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے ہوں، اس میں ایسے مسلمان افراد بھی ہوں جو بدکاری کے اڈے چلا رہے ہوں یا جن کا ناجائز تعلق یاری آشنائی کی صورت میں روزمرہ کے معمول کی صورت اختیار کر چکا ہو۔'' مولانا کا فرمانا ہے کہ ''کوئی بھی باغیرت مسلمان اس تصور کو اپنے دل و دماغ میں جگہ نہیں دے سکتا۔'' (مقام عبرت، ص ۳۰)

تاہم مولانا محترم نے یہ سامنے کی بات نظر انداز کر دی ہے کہ عہد نبوی کے معاشرے نے اخلاقی تزکیہ وتطہیر کے سارے مراحل ایک ہی جست میں طے نہیں کر لیے تھے، اور اس معاشرے میں آپ کے تربیت یافتہ اور بلند کردار صحابہ کے علاوہ منافقین اور تربیت سے محروم کمزور مسلمانوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو مختلف اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں میں مبتلا تھی اور ان کی اصلاح وتطہیر کا عمل، جتنا بھی ممکن تھا، ایک تدریج ہی کے ساتھ ممکن تھا۔ اس طرح کے گروہوں میں نہ صرف پیشہ ورانہ بدکاری اور یاری آشنائی کے تعلقات کی مثالیں پائی جاتی تھیں بلکہ اپنی مملوکہ لونڈیوں کو زنا پر مجبور کر کے ان کے ذریعے سے کسب معاش کا سلسلہ بھی جاری وساری تھا، چنانچہ قرآن مجید کو اس تناظر میں اس بات کی باقاعدہ وضاحت کرنا پڑی کہ جن لونڈیوں کو اپنی مرضی کے خلاف مجبوراً اس دھندے میں ملوث ہونا پڑتا ہے، اللہ تعالیٰ ان سے کوئی مواخذہ نہیں کرے گا۔ سورۂ نور میں ارشاد ہوا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا وَآتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْ آتَاكُمْ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَنْ يُكْرِهْهُّنَّ فَإِنَّ اللّٰهَ مِنْ بَعْدِ إِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (النور ۲۴: ۳۳)

''اور تمہارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت کا معاملہ کرنا چاہیں، اگر تم ان کے اندر بھلائی دیکھو تو ان کے ساتھ مکاتبت کر لو، اور (مکاتبت کی رقم ادا کرنے کے لیے) انھیں وہ مال بھی دو جو اللہ نے تمھیں دیا ہے۔ اور تمہاری لونڈیاں اگر پاک دامنی اختیار کرنا چاہتی ہیں تو دنیا کی زندگی کا سامان حاصل کرنے کے لیے انھیں بدکاری پر مجبور نہ کرو۔ اور جو شخص انھیں مجبور کرے گا تو بے شک اللہ ان لونڈیوں کے مجبور کیے جانے کے بعد بخشنے والا، مہربان ہے۔''

اس آیت کے تحت امام طبری اور دوسرے ''باغیرت'' مفسرین نے متعدد ایسے واقعات نقل کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ میں عین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ مکروہ کاروبار جاری تھا۔ مجاہدؒ بیان کرتے ہیں:

كانوا يامرون ولائدهم يباغين يفعلن ذلك فيصبن فياتينهم بكسبهن فكانت لعبد الله بن ابى ابن سلول جارية فكانت تباغى فكرهت وحلفت ان لا تفعله فاكرهها اهلها فانطلقت فباغت ببرد اخضر فاتتهم به فانزل الله تبارك وتعالىٰ ولا تكرهوا فتياتكم على البغاء (تفسیر طبری، ۱۷۶/۱۹)

''لوگ اپنی لونڈیوں کو مامور کرتے تھے کہ وہ بدکاری کریں اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی لا کر اپنے مالکوں کو دیں۔ اسی طرح عبد اللہ بن ابی سلول کی بھی ایک لونڈی تھی جو بدکاری کیا کرتی تھی، پھر اسے اس سے نفرت ہوگئی اور اس نے قسم کھا لی کہ وہ ایسا نہیں کرے گی، لیکن اس کے مالکوں نے اسے مجبور کیا۔ چنانچہ وہ گئی اور بدکاری کر کے اس کے عوض میں ایک سبز رنگ کی چادر لائی اور انھیں دے دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری کہ اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو۔''

مولانا محترم نے اسی طرح کے تخیلات کا اظہار آگے چل کر عہد نبوی میں زنا بالجبر کے امکان کے حوالے سے بھی کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ریاست مدینہ میں سرے سے اس بات کا کوئی امکان ہی نہیں تھا کہ کوئی شخص زنا بالجبر کا ارتکاب کر سکے۔ فرماتے ہیں:

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت اتنی کمزور تھی اور یہ منافق اتنے جری نہیں تھے کہ اعلانیہ لوگوں کی عزت وآبرو پر ہاتھ ڈال سکیں اور کھلم کھلا زنا بالجبر کر سکیں۔ وہ تو بس دبے لفظوں میں کچھ بے حیائی کے کلمات کہہ دیتے تھے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی معمولی بے حیائی کو بھی برداشت نہیں کیا اور تنبیہ فرما دی۔'' (مقام عبرت، ص ۴۲)

ممکن ہے مولانا محترم کا یہ مفروضہ منافقین کے بارے میں درست ہو، لیکن جہاں تک مخلص اور خدا ترس اہل ایمان کا تعلق ہے تو مستند روایات کی رو سے وہ ایسا کرنے کی پوری پوری جرات رکھتے تھے۔ چنانچہ وائل بن حجر روایت کرتے ہیں کہ عہد نبوی میں ایک شخص نے نماز کے لیے مسجد جاتی ہوئی ایک خاتون کو راستے میں تنہا پا کر اسے پکڑ لیا اور زبردستی اس کے ساتھ بدکاری کر کے بھاگ گیا، تاہم بعد میں جب اس کے شبہے میں ایک دوسرے شخص کو پکڑ لیا گیا اور اس پر سزا نافذ کی جانے لگی تو اصل مجرم نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

اسے سنگسار کرنے کا حکم دے دیا۔ (ابوداؤد، رقم ۴۴۳۷۔ ترمذی، رقم ۱۴۵۴)

جہاں تک بحث کے دوسرے نکتے یعنی قرآن کی بیان کردہ سزا پر جلا وطنی اور رجم کی سزا کے اضافے کا تعلق ہے تو مولانا محترم نے اس ضمن میں مختلف پہلووں سے ہماری رائے میں آٹھ خرابیوں کی نشان دہی کی ہے۔ مولانا کے ارشادات کا بیشتر حصہ خلط مبحث اور سوء فہم پر مبنی ہے جس کی توضیح نہ صرف خاصی تطویل کی متقاضی ہے بلکہ اصل سوال یعنی قرآن اور سنت کے احکام میں تطبیق کے پہلو سے زیادہ مفید بھی نہیں، اس لیے یہاں ہم بحث کے اس حصے سے سردست صرف نظر کرتے ہوئے یہ دیکھتے ہیں کہ مولانا محترم نے اصل الجھن کا کیا حل پیش کیا ہے۔ مولانا محترم کی رائے میں شریعت میں زنا کی سزا تین مرحلوں میں نازل کی گئی:

پہلے مرحلے میں سورۂ نساء کی آیات میں یہ کہا گیا کہ شادی شدہ عورتوں کو زنا کے ارتکاب پر گھروں میں محبوس کر دیا جائے، تا آنکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیا حکم آ جائے، جبکہ کنوارے زانیوں کو مناسب تعزیر کی جائے۔

دوسرے مرحلے میں عبادہ بن صامت کی روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی شدہ زانیوں کی سزا سو کوڑے اور رجم جبکہ کنوارے زانیوں کی سزا سو کوڑے اور جلا وطنی مقرر فرمائی۔

تیسرے مرحلے پر سورۂ نور کی آیت نازل ہوئی جس میں کنوارے زانیوں کی سو کوڑے مقرر کرتے ہوئے جلا وطنی کی سزا کو منسوخ کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی قرآن مجید میں رجم کی آیت بھی نازل کی گئی جس میں شادی شدہ زانیوں سے سو کوڑوں کی سزا کو منسوخ کر کے صرف رجم کی سزا برقرار رکھی گئی۔ بعد میں اس آیت کے الفاظ تو منسوخ کر دیے گئے، لیکن حکم باقی رکھا گیا۔

مولانا محترم کا ارشاد ہے کہ ان کی بیان کردہ اس توجیہ پر ان اعتراضات میں سے کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا جو ہم نے سابق اہل علم کی پیش کردہ مختلف توجیہات پر وارد کیے ہیں۔ (مقام عبرت، ص ۴۳) ان کے اس ارشاد سے ہمیں گمان ہوتا ہے کہ ہماری پیش کردہ معروضات ان کی سنجیدہ توجہ سے محروم رہی ہیں اور انھوں نے غالباً ان کا پوری طرح مطالعہ کیے بغیر ہی تنقید کے لیے قلم اٹھا لیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا کی یہ توجیہ حسب ذیل مفروضات پر مبنی ہے:

۱۔ آیت نور صرف کنوارے زانیوں کی سزا بیان کرتی ہے۔

۲۔ رجم کی آیت قرآن میں نازل کیے جانے کے بعد اس کے الفاظ منسوخ کر دیے گئے جبکہ حکم برقرار رکھا گیا۔

ہم نے اپنی کتاب میں ان دونوں نکتوں کے حوالے سے اپنے اشکالات کی تفصیلی وضاحت کی ہے۔ قارئین کی

دلچسپی کے لیے یہاں متعلقہ اقتباسات نقل کرنا مناسب ہوگا۔

پہلے نکتے پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے گزارش کی ہے کہ:

''اگر یہ کہا جائے کہ قرآن میں بیان ہونے والی سزا کے غیر شادی شدہ زانیوں کے ساتھ خاص ہونے کے لسانی یا عقلی قرائن خود قرآن میں موجود ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھی قرائن وشواہد سے یہ بات اخذ کی ہے تو زبان کی ابانت وبلاغت یہ تقاضا کرتی ہے کہ تخصیص کے ان قرائن کا فہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ مخصوص نہ ہو بلکہ زبان کا معیاری اور عمدہ ذوق رکھنے والے اصحاب علم بھی ان قرائن کی مدد سے اسی نتیجے تک پہنچ سکیں، لیکن خود امام صاحب کے اعتراف کے مطابق یہ واضح ہے کہ ایسا کوئی قرینہ کلام میں موجود نہیں۔....

دوسری صورت یہ فرض کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کلام میں تو اس تخصیص کے قرائن نہ رکھے ہوں، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی الگ سے یہ بتا دیا ہو کہ 'الزانیة والزانی' سے مراد صرف غیر شادی شدہ زانی ہیں۔ اس صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کلام کے مدعا ومفہوم کے ابلاغ کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنے کی آخر کیا ضرورت تھی؟ کیا قرآن کی زبان اس کی متحمل نہیں تھی کہ اس تخصیص کے قرائن کو اپنے اندر سمو سکتی؟ پھر یہ کہ جب قرآن نے زنا کی سزا کے بیان کو باقاعدہ موضوع بنایا ہے تو مجرم کے حالات کے لحاظ سے اس جرم کی جو مختلف سزائیں دینا اللہ تعالیٰ کے پیش نظر تھا، ان کی وضاحت میں کیا چیز مانع تھی؟ قرآن کے اسلوب کا ایجاز مسلم ہے، لیکن عدت، وراثت اور قتل خطا وغیرہ کی مختلف صورتوں اور ان کے الگ الگ احکام کی تفصیل کا طریقہ خود قرآن میں اختیار کیا گیا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ زنا کی سزا کے معاملے میں اس معروف اور مانوس طریقے کو چھوڑ کر ایک ایسا انداز اختیار کیا گیا جو نہ صرف زبان وبیان کے عمومی اسلوب بلکہ خود قرآن کے اپنے طرز گفتگو سے بھی بالکل ہٹ کر ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ امام شافعی کا یہ نقطۂ نظر قرآن مجید کی زبان کی ابانت اور زبان وبیان کے اسالیب کے حوالے سے ایک عجیب الجھن پیدا کر دیتا ہے اور انھوں نے معاملے کو ضرورت سے زیادہ سادہ بنا کر پیش کرنے (oversimplification) کی کوشش کی ہے جسے علمی بنیادوں پر قبول کرنا ممکن نہیں۔'' (حدود وتعزیرات، ص ۱۴۷، ۱۴۸)

دوسرے نکتے کے حوالے سے ہم نے عرض کیا ہے:

''ایک نقطۂ نظر یہ پیش کیا گیا ہے کہ شادی شدہ زانی کے لیے رجم کی آیت خود قرآن مجید میں نازل ہوئی تھی جو بعد میں الفاظ کے اعتبار سے تو منسوخ ہو گئی، لیکن اس کا حکم باقی رہ گیا۔ اس موقف کے حق میں بنائے استدلال بالعموم سیدنا عمر کی طرف منسوب ایک روایت کو بنایا جاتا ہے۔.... سیدنا عمر کی طرف اس قول کی نسبت کے صحیح

ہونے میں ایک اہم اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے اس خطبے کے راوی عبداللہ بن عباس ہیں، لیکن خود ان کی رائے قرآن مجید میں رجم کا کوئی باقاعدہ حکم نازل ہونے کے برعکس ہے۔.... روایتوں سے واضح ہے کہ ابن عباس قرآن مجید میں واضح طور پر رجم کا حکم نازل ہونے کے قائل نہیں اور اس کے بجائے اسے اشارتاً قرآن میں مذکور مانتے اور اس کا اصل ماخذ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو قرار دیتے ہیں۔ اگر وہ فی الواقع سیدنا عمر کے مذکورہ خطبے کے راوی ہیں جس میں انھوں نے رجم کے قرآن مجید میں نازل ہونے کا ذکر کیا ہے تو پھر ان کا اس سے مختلف رائے قائم کرنا بظاہر سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔

یہ روایات اس حوالے سے باہم متعارض ہیں کہ رجم کا حکم آیا قرآن مجید کی کسی باقاعدہ آیت کے طور پر نازل ہوا تھا یا قرآن سے باہر کسی الگ حکم کے طور پر۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت باقاعدہ قرآن مجید کے ایک حصے کے طور پر نازل ہوئی تھی اور اسی حیثیت سے پڑھی جاتی تھی۔...... اس کے برعکس بعض دوسری روایات یہ بتاتی ہیں کہ کہ یہ قرآن مجید سے الگ ایک حکم تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حین حیات میں اسے قرآن مجید میں لکھنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔.... بہر حال رجم کا حکم قرآن مجید میں نازل کیے جانے کے بعد اس سے نکال لیا گیا ہو یا ابتدا ہی سے اسے قرآن کا حصہ بنانے سے گریز کیا گیا ہو، دونوں صورتوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر شارع کے پیش نظر اس کو ایک مستقل حکم کے طور پر برقرار رکھنا تھا تو مذکورہ طریقہ کیوں اختیار کیا گیا؟ اگر یہ مانا جائے کہ شادی شدہ زانی کو رجم کرنے کی آیت قرآن میں نازل ہونے کے بعد اس سے نکال لی گئی تو اس کی واحد معقول توجیہ یہی ہو سکتی ہے کہ اب یہ حکم بھی منسوخ ہو چکا ہے، ورنہ حکم کو باقی رکھتے ہوئے آیت کے الفاظ کو منسوخ کر دینے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اور اگر یہ فرض کیا جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ حکم تو دیا گیا تھا لیکن اسے قرآن مجید کا حصہ بنانے سے بالقصد گریز کیا گیا تو بظاہر یہ اس کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ ایک وقتی نوعیت کا حکم تھا جسے ابدی شرعی احکام کی حیثیت سے برقرار رکھنا اللہ تعالیٰ کے پیش نظر نہیں تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں صرف اسی سزا کے بیان پر اکتفا کی جسے ابدی طور پر باقی رکھنا ضروری تھا۔'' (حدود و تعزیرات، ۱۵۶۔۱۵۹)

ان میں سے کوئی اشکال ایسا نہیں جو مولانا کی توجیہ سے حل ہوتا ہو یا انھوں نے اپنی تنقید میں اس سے کوئی تعرض ہی کیا ہو۔ اس وجہ سے مولانا محترم کا یہ دعویٰ کہ انھوں نے اشکالات سے پاک کوئی توجیہ پیش کر دی ہے، ہماری لیے کسی طرح قابل فہم نہیں۔

مولانا محترم کی تنقید کے 'علمی' نکات کے حوالے سے تو ہمیں یہی گزارشات پیش کرنا تھیں، البتہ بحث کے آخر میں، افسوس ہے کہ ہمیں ان کی ایک 'غیر علمی' بات پر بھی تبصرہ کرنا پڑ رہا ہے۔ مولانا محترم نے اپنی تنقید ہمیں بھجوائی اور

اس سے اتفاق یا اختلاف کے ضمن میں ہماری رائے بھی دریافت فرمائی۔ ہم نے ایک خط میں، جو 'الشریعہ' کے جنوری ۲۰۰۹ کے شمارے میں چھپ چکا ہے، اس بات پر ان کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ کہ انھوں نے ہماری آرا پر تنقید کرتے ہوئے علمی اسلوب اختیار کیا ہے، یہ گزارش بھی کی کہ ان کے اٹھائے ہوئے نکات فی نفسہ قابل قدر ہونے کے باوجود ایسے نہیں ہیں کہ ہم ان کی بنیاد پر سردست اپنی رائے میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس کریں۔ مولانا محترم نے ہمارے اس جواب پر ''مایوس'' ہو کر اپنی یہ تحریر ایک کتابچے کی صورت میں شائع کی اور اس کی تقسیم کا اہتمام کیا جس کا انھیں پورا پورا حق ہے، تاہم اس کی ابتدا میں انھوں نے اپنی اس ساری کدوکاوش کا جو محرک اور مقصد بیان فرمایا ہے، وہ ہمارے نزدیک علمی، اخلاقی اور شرعی حدود سے متجاوز ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

> ''ہم نے فیصلہ کیا کہ قارئین کی خدمت میں اپنی بات رکھ دیں تاکہ وہ بھی ہماری ہم نوائی میں ہو کر خاندان صفدریہ کے ایک باصلاحیت فرد کو اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں غلط راہوں میں صرف کرنے سے روکیں۔ ہم خاندان صفدریہ سے عموماً اور مولانا زاہد الراشدی مدظلہ سے خصوصاً مودبانہ درخواست کرتے ہیں کہ اصلاح احوال میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہ کریں۔'' (ص۲)

مولانا محترم کا یہ ارشاد اس بحث کو ایک علمی و فکری بحث نہیں رہنے دیتا، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ علمی و جمہوری اصولوں کے دائرے میں سوالات واشکالات کا سامنا کرنے کے بجائے جبر اور دباؤ کے ذریعے سے انھیں ''روکنے'' اور اختلافی آرا کے لیے اظہار وابلاغ کا حق تسلیم کرنے کے بجائے ان کی ''اصلاح احوال'' کے فلسفے پر یقین رکھتے ہیں۔ مزید ستم یہ ہے کہ وہ اسی طرز عمل کی توقع خاندان صفدریہ سے بھی فرما رہے ہیں، جس کے بزرگوں کی علمی وفکری کاوشوں کا طرۂ امتیاز ہی یہ ہے کہ فروعی فقہی مباحث تو کیا، ایمان واعتقاد کے دائرے میں بھی کسی بڑی سے بڑی غلطی پر تنقید کرتے ہوئے وہ علم واستدلال ہی سے کام لیتے اور استدلال کے ذریعے سے کسی بات کی غلطی واضح کر دینے تک ہی اپنے آپ کو محدود رکھتے ہیں۔ مولانا محترم جو طریقہ تجویز فرما رہے ہیں، اس کے پیچھے یقیناً ان کا خلوص اور شریعت کی روایتی تعبیر کے درست ہونے پر کامل یقین کارفرما ہوگا، اس لیے کہ مذہبی لوگوں کے ہاں یقین اور خلوص کا اعلیٰ ترین اظہار زبردستی اور دھونس ہی کی صورت میں ہوتا ہے، لیکن انھیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ دین وشریعت کا فہم اور اس کی تعبیر وتشریح انسانی عقل کا وظیفہ ہے، اس لیے جب تک انسان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت باقی ہے ــــــ اور صدیوں سے 'کشتۂ سلطانی وملائی وپیری' ہونے کے باوجود بہرحال کچھ نہ کچھ باقی ہے ــــــ علمی وفکری سوالات بھی پیدا ہوتے رہیں گے، آرا وتعبیرات پر نظر ثانی کی ضرورت بھی سامنے آتی رہے گی اور تقلیدی جمود کی عائد کردہ

ساری قدغنوں کے علی الرغم علم وفکر بھی اپنے ارتقا کا سفر جاری رکھیں گے۔ اس سلسلے کو روکنے کی کوشش فطرت سے جنگ کے مترادف ہے، اس لیے ایسی کوئی کوشش نہ اس سے پہلے کبھی کامیاب ہوئی ہے اور نہ ان شاء اللہ آئندہ اس کے کامیاب ہونے کا کوئی امکان ہے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ پہلے کی طرح ان نئی آرا میں بھی راہ راست سے انحراف اور اختلاف کے جائز حدود سے تجاوز کی مثالیں پائی جائیں گی، لیکن یہ کوئی معقول طریقہ نہیں ہے کہ آپ جسم کو پھوڑے سے بچانے کے لیے خود جسم ہی کی فطری نشوونما کا راستہ روک دیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ امت مسلمہ کی علمی روایت کی پختگی اور صلابت پر ہمارا یقین روایتی طرز فکر کے علما سے زیادہ ہے، اس لیے کہ علما کوئی بھی نئی راے سامنے آنے پر فوراً اس خوف کا شکار ہو جاتے ہیں کہ اس سے دین وشریعت کی تحریف کا راستہ کھل جائے گا، جبکہ ہمیں اس بات پر پورا اطمینان ہے کہ کوئی ایسی راے جو ہماری علمی روایت کے بنیادی مسلمات اور اس کے فکری مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو، اس روایت کے اندر اپنی جگہ بنا ہی نہیں سکتی۔ یہ روایت اتنی مستحکم اور مضبوط ہے کہ ہم جیسے طالب علموں کا تو کیا شمار، اگر ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کی سطح کے اکابر بھی ایسی کوئی بات کہیں گے تو علمی روایت اسے صاف صاف اگل دے گی۔ اس لیے صحیح ذہنی رویہ یہ ہے کہ آپ تحفظات اور خدشات کے خول سے باہر نکل کر علمی آرا اور افکار کی تنقیح وتہذیب کے اس عمل میں مثبت طور پر شریک ہو جائیں۔ کسی نئی بات میں وزن محسوس ہو تو کمزور نفسیات کا شکار ہو کر اسے قبول کرنے سے گریز نہ کریں، بات کمزور نظر آئے تو علمی طریقے پر اس کی غلطی واضح کریں، کوئی خلا ہو تو اس کی نشان دہی کریں، کوئی حقیقی علمی اصول پامال ہو رہا ہو تو نقد ومحاسبہ کا حق استعمال کریں ـــــ یہ سب کریں، لیکن شکوہ، شکایت، جھنجھلاہٹ، بے چینی اور اضطراب میں مبتلا نہ ہوں اور نہ علم واستدلال کی میزان کی جگہ فتووں کا ہتھیار ہاتھ میں لے کر فکر ونظر کے ارتقا پر 'حکم' بننے کی کوشش کریں۔

ریحان احمد یوسفی

ہم کو نہیں

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو قیامت تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رکھنے کا اہتمام کیا ہے۔ یہ تحفظ قدیم الہامی کتابوں کو حاصل نہیں تھا۔ اس لیے ان میں معنوی تحریفات اور لفظی تبدیلیوں کا دروازہ کھلا رہا۔ تاہم اس کے باوجود ان کتابوں کے بہت سے مقامات پر دین کی اصل تعلیمات بعینہٖ موجود ہیں۔ بعض اوقات تو ان کے الفاظ بھی وہی ہیں جو قرآن کریم میں آئے ہیں۔ مثلاً سورہ اعراف میں بت پرستی پر تنقید کرتے ہوئے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اسے ملاحظہ کیجیے۔

''کیسے نادان ہیں یہ لوگ کہ ان کو خدا کا شریک ٹھیراتے ہیں جو کسی چیز کو بھی پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔ جو نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ آپ اپنی مدد پر قادر ہیں۔ اگر تم انھیں سیدھی راہ پر آنے کی دعوت دو تو وہ تمھارے پیچھے نہ آئیں، تم خواہ انھیں پکارو یا خاموش رہو، دونوں صورتوں میں تمھارے لیے یکساں ہی رہے۔ تم لوگ خدا کو چھوڑ کر جن لوگوں کو پکارتے ہو وہ تو محض بندے ہیں جیسے تم بندے ہو۔ ان سے دعائیں مانگ کر دیکھو، یہ تمھاری دعاؤں کا جواب دیں اگر ان کے بارے میں تمھارے خیالات صحیح ہیں۔ کیا یہ پاؤں رکھتے ہیں کہ ان سے چلیں؟ کیا یہ ہاتھ رکھتے ہیں کہ ان سے پکڑیں؟ کیا یہ آنکھیں رکھتے ہیں کہ ان سے دیکھیں؟ کیا یہ کان رکھتے ہیں کہ ان سے سنیں؟''، (اعراف: ۷: ۱۹۵-۱۹۱)

یہی مضمون زبور میں جن الفاظ میں بیان ہوا ہے، اب اسے ملاحظہ کیجیے۔

''ان کے بت چاندی اور سونا ہیں یعنی آدمی کی دستکاری۔ ان کے منہ ہیں پر وہ بولتے نہیں۔ آنکھیں ہیں پر وہ دیکھتے نہیں۔ ان کے کان ہیں پر وہ سنتے نہیں۔ ناک ہے پر وہ سونگھتے نہیں۔ ان کے ہاتھ ہیں پر وہ چھوتے نہیں اور ان کے گلے سے آواز نہیں نکلتی۔ انکے بنانے والے ان ہی کی مانند ہو جائیں گے۔ بلکہ سب جو ان پر بھروسا

رکھتے ہیں۔''، (زبور ۱۱۵: ۸۔۴)

زبور کی جس حمد کا حوالہ ہم نے دیا ہے، اس کا آغاز بھی بڑا بے مثل ہے۔ اس کا پہلا بند اس طرح ہے:

''ہمکو نہیں! اے خداوند! ہم کو نہیں

بلکہ تو اپنے ہی نام کو

اپنی شفقت اور سچائی کی خاطر جلال بخش۔''، (زبور ۱۱۵: ۱۔۱))

زبور کے یہ الفاظ ایک مخلص داعی حق کے دل سے نکلنے والے سچے ترین الفاظ ہیں۔ اس کے جذبات کی ترجمانی کے لیے اس سے زیادہ موزوں الفاظ ملنا مشکل ہے۔ بندہ مومن کی اصل دلچسپی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتی ہے۔ اللہ کی بڑائی، اس کی عظمت، اس کی کبریائی، اس حمد، اس کی تعریف، اس کا شکر، اس کی تسبیح اور اس ہی کی تقدیس کرنا اس کی زندگی کا مشن ہوتا ہے۔ وہ خدا کے دشمنوں کے خلاف لڑتا ہے۔ اس کے دین کی مدد کو اپنی زندگی کا مقصد بناتا ہے۔ شرک و الحاد کے اندھیروں میں شمع توحید جلاتا ہے۔ بت پرستی اور دنیا کے دور میں خدا پرستی کا علم اٹھاتا ہے۔ شیطان اور اس کے لشکروں کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا ہے۔

اس راہ میں وہ ہر مشقت جھیلتا اور ہر تکلیف اٹھاتا ہے۔ ہر ملامت سنتا اور ہر ایذا سہتا ہے۔ ہر دشمن حق سے مقابلہ کرتا اور ہر میدان میں لڑتا ہے۔ لیکن اس ساری سعی و جہد کا مقصود صرف ایک ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جس رب سے اسے سب سے زیادہ محبت ہے، اس کی کبریائی کا پرچم ہر چوٹی پر گاڑ دیا جائے۔ جس خدا نے انسان کو سب کچھ دیا ہے، انسان اس خدا کا شکر گزار بن جائے۔ جس خدا کے ہاتھ میں دنیا و آخرت کا ہر نفع و ضرر ہے، لوگ اسی خدا کی عبادت کریں اور اسی کے سامنے دست سوال دراز کریں۔

داعی حق کی دلچسپی کبھی اس بات سے نہیں ہوتی ہے کہ اس کی ستائش ہو اور لوگوں سے اسے کوئی صلہ ملے۔ اس کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی کہ لوگ اسے اچھا کہیں یا لعنت و ملامت کا ہدف بنائیں۔ اپنی ذات کی سر بلندی، اپنے مفادات کا حصول، اپنے اسلاف کی عظمت اور اپنی قوم کے لیے کوئی تعصب، یہ اس کے مسائل نہیں ہوتے۔ اپنا فرقہ، اپنا مسلک، اپنے اکابرین، اپنی جماعت کی قسم کے الفاظ اس کی لغت میں نہیں ہوتے۔ مقلدین اور مریدوں سے اپنی عظمت کے ترانے پڑھوانا، اپنے نام کے ساتھ درجن بھر القاب لگوانا، اپنے پیروکاروں پر اپنی عظمت اور بزرگی کا سکہ بٹھانا، اپنی کرامات اپنے علم اور اپنی ذہانت و خطابت کا ڈھنڈورا پٹوانا کبھی اس کے پیش نظر نہیں ہوتا۔

وہ عارف باللہ ہوتا ہے۔ جانتا ہے کہ وہ صرف خاک ہے؛ وہ صرف راکھ ہے۔ اسے خدا کی عطاؤں میں سے اگر کچھ ملتا ہے وہ اسے گدائے بے نوا کو ایک شہنشاہ کی طرف سے ملنے والی بھیک سمجھتا ہے۔ اسے کوئی مادی کامیابی مل بھی جائے تو وہ اسے اپنے رب علیم و حکیم کی آزمائش سمجھتا ہے۔ کوئی خدمت اس سے لے لی جائے تو اسے اپنی سعادت سمجھتا ہے۔

یہی داعی حق ہوتا ہے اور صرف یہی داعی حق ہوتا ہے۔ ان احساسات سے ہٹ کر جو لوگ خدا کے نام پر کھڑے ہوتے ہیں وہ خدا کی نظر میں کسی مسخرے سے بڑھ کر نہیں ہوتے۔ یہ مسخرے جلد یا بدیر اپنے انجام کو پہنچ کر رہتے ہیں۔ رہے سچے داعی حق تو ان کی صدا ایک ہی ہوتی ہے۔

ہمکو نہیں! اے خداوند! ہم کو نہیں
بلکہ تو اپنے ہی نام کو
اپنی شفقت اور سچائی کی خاطر جلال بخش

محمد رفیع مفتی

متفرق سوالات

[المورد میں خطوط اور ای میل کے ذریعے سے دینی موضوعات پر سوالات موصول ہوتے ہیں۔ المورد کے شعبۂ علم و تحقیق کے رفقا ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ ان میں سے منتخب سوال و جواب کو افادۂ عام کے لیے یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔]

خدا کا علم اور انسان کی آزادی

سوال: خدا جبکہ بہت مہربان ہے تو اس نے ان لوگوں کو پیدا ہی کیوں کیا جنھیں اس کے علم کے مطابق اپنی آزاد مرضی سے گناہ کر کے دوزخ میں جانا تھا؟ (محمد عبدالعزیز)

جواب: اگر خدا اس شخص کو پیدا نہ کرے جو اس کے علم کے مطابق دوزخ میں جانے والا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس پر اپنے علم کو جبراً نافذ کر رہا ہے۔ خدا نے یہ جبر نہیں کیا؟ بلکہ ہر آدمی کو صحیح فطرت پر، یعنی نیکی کو پسند کرنے والا بنا کر پیدا کیا، جنت کو اس کے لیے انتہائی پسندیدہ چیز بنایا، دنیا کے اس امتحان میں کامیاب ہونے کی پوری صلاحیت اس کے اندر رکھ دی اور اب اسے اختیار و ارادہ کی آزادی دے دی کہ خواہ وہ نیک کام کرے اور جنت میں جائے یا بد کام کرے اور دوزخ میں جائے۔ بتایئے، اس میں کیا غلطی ہے؟ ہاں، اگر انسان اپنی فطرت ہی میں برا انسان بنایا گیا ہوتا اور خدا نے اس کے اندر دنیا کے اس امتحان میں کامیاب ہونے کی صلاحیت ہی نہ رکھی ہوتی تو پھر یقیناً خدا کا ایسے شخص کو دنیا کے امتحان میں ڈالنا ظلم تھا۔

اس کی مثال یہ ہو سکتی ہے کہ جس لڑکے کے بارے میں والدین کا خیال ہو کہ اسے اگر پڑھنے کے لیے کالج میں بھیجا گیا تو محض اپنی کام چوری کی وجہ سے یہ امتحان میں ناکام ہو گا، کیا والدین کا اسے جبراً کالج نہ بھیجنا اور امتحان

دینے کا موقع ہی نہ دینا درست ہوگا؟ میرا خیال ہے کہ اگر لڑکے کو اختیار و ارادہ کی آزادی دینی ہے اور محنت کر کے امتحان میں کامیاب ہونے کی صلاحیت اس کے پاس ہے، کامیابی اس کو انتہائی عزیز ہے تو پھر اس پر کوئی جبر نہیں ہونا چاہیے، خواہ آپ کے اندازے جو کچھ بھی ہوں۔

البتہ اگر لڑکا کند ذہن ہے، اس کے پاس علم حاصل کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے اور وہ کوئی علم و فن سیکھ ہی نہیں سکتا تو پھر اس کے بارے میں اپنے اس خیال پر عمل کرنا بالکل درست ہوگا کہ اسے کالج میں بھیجا ہی نہ جائے۔

غیر محرم سے اختلاط

درج ذیل سوالات کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

سوال: پہلا یہ کہ کیا کوئی نوجوان اپنی ہم عمر رشتہ دار لڑکیوں سے گفتگو اور گپ شپ کی حد تک تعلق رکھ سکتا ہے اور کیا وہ انھیں دیکھ بھی سکتا ہے؟

دوسرا یہ کہ کسی لڑکی سے محبت کرنا، اس کے بارے میں سوچنا، شاعری کرنا اور خیال ہی خیال میں اسے چاہتے رہنا، کیا جائز ہے؟

تیسرا یہ کہ وہ نوجوان کم عمر رشتہ دار لڑکی جس کے بارے میں آدمی کا ذہن عشق و محبت کے جذبات سے خالی ہو، کیا اس سے گفتگو وغیرہ کرنا جائز ہے؟ (عبدالعزیز)

جواب: آپ کے ان سوالوں کے جواب میں یہ گزارش ہے کہ دین کا مقصد تزکیہ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان پاکیزہ بنے۔ اس میں شرم و حیا بھی موجود ہو، خدا خوفی بھی ہو اور پاکیزہ نفسی بھی ہو۔

چنانچہ اصل بات یہ ہے کہ غیر محرم افراد کا میل جول کسی معقول وجہ ہی سے اور کسی مقصد ہی کے لیے ہونا چاہیے، خواہ مخواہ اور محض گپ شپ کی خاطر یہ درست نہیں ہے۔ مرد اور عورت اپنی ساخت ہی کے اعتبار سے اس طرح کے بنائے گئے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے کے ساتھ جنسی رغبت پیدا ہو، لہٰذا خواہ مخواہ میل ملاقات کے مواقع پیدا کرنا اور گفتگو کرنا، کسی صورت میں بھی درست نہیں، لیکن اگر کسی واقعی ضرورت یا مجبوری کے تحت غیر محرم افراد کو باہم ملنا جلنا پڑے تو اس کی اجازت ہے، لیکن اس صورت میں یہ ضروری ہے کہ غض بصر اور حفظ فروج کے ان آداب کو ملحوظ رکھا جائے جو اسلام نے بتائے ہیں۔

غامدی صاحب نے اپنی کتاب ''میزان'' کے باب ''قانون معاشرت'' میں ان آداب کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

''اسلام نے اختلاط مردوزن کے درج ذیل آداب سکھائے ہیں:

۱۔ایک دوسرے کے گھروں میں جانے کی ضرورت پیش آ جائے تو بے دھڑک اور بے پوچھے اندر داخل ہونا جائز نہیں ہے۔ پہلے اجازت مانگنی چاہیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اجازت عین گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر اور اندر جھانکتے ہوئے نہیں مانگنی چاہیے، اس لیے کہ اجازت مانگنے کا حکم تو دیا ہی اس لیے گیا ہے کہ گھر والوں پر نگاہ نہ پڑے۔

۲۔عورتیں اور مرد ایک دوسرے سے اپنی نظریں بچا کر رکھیں۔ نگاہوں میں حیا ہو اور مرد و عورت ایک دوسرے کے حسن و جمال سے آنکھیں سینکنے، خط و خال کا جائزہ لینے اور ایک دوسرے کو گھورنے سے پرہیز کریں۔ نہ وہ باہم نگاہ بھر کر دیکھیں اور نہ اپنی نگاہوں کو ایک دوسرے کو دیکھنے کے لیے بالکل آزاد چھوڑ دیں۔ اس طرح کا پہرا اگر نگاہوں پر نہ بٹھایا جائے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں یہ آنکھوں کا زنا ہے اور یہی وہ نگاہ ہے جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو نصیحت فرمائی ہے کہ اسے فوراً پھیر لینا چاہیے۔

جریر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور سے پوچھا: اس طرح کی نگاہ اچانک پڑ جائے تو کیا کروں؟ فرمایا: فوراً نگاہ پھیر لو یا نیچی کر لو۔

۳۔باہمی میل جول کے موقعوں پر شرم گاہوں کی حفاظت کی جائے۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ تعبیر ناجائز شہوت رانی سے پرہیز کے لیے اختیار کی گئی ہے، لیکن اس سے متعلق سورۂ نور کی آیات میں قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد عورتوں اور مردوں کا اپنے صنفی اعضا کو اچھی طرح ڈھانپ کر رکھنا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ مرد و زن ایک جگہ موجود ہوں تو چھپانے کی جگہوں کو اور بھی زیادہ اہتمام کے ساتھ چھپانا چاہیے۔ اس میں ظاہر ہے کہ بڑا دخل اس چیز کو ہے کہ لباس باقرینہ ہو۔ عورتیں اور مرد، دونوں ایسا لباس پہنیں جو زینت کے ساتھ صنفی اعضا کو بھی پوری طرح چھپانے والا ہو۔ پھر ملاقات کے موقع پر اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اٹھنے بیٹھنے میں کوئی شخص برہنہ نہ ہونے پائے۔ شرم گاہوں کی حفاظت سے یہاں قرآن کا مقصود یہی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ مسلمانوں کی معاشرت میں غض بصر کے ساتھ یہ چیز بھی پوری طرح ملحوظ رکھی جائے۔

۴۔عورتوں کے لیے، بالخصوص ضروری ہے کہ وہ زیب و زینت کی کوئی چیز اپنے قریبی اعزہ اور متعلقین کے سوا کسی شخص کے سامنے ظاہر نہ ہونے دیں۔ یہاں تک کہ مردوں کی موجودگی میں اپنے پاؤں زمین پر مار کر چلنے سے بھی پرہیز کرنا چاہیے کہ ان کی چھپی ہوئی زینت ظاہر نہ ہو جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر عورتوں کے تیز

خوشبو لگا کر باہر نکلنے کو سخت ناپسند فرمایا ہے۔‘‘ (میزان ۴۶۴-۴۶۵)

تفصیل کے لیے آپ غامدی صاحب کی کتاب ’’میزان‘‘ کے باب ’’قانون معاشرت‘‘ میں اس سے متعلق بحث ’’مرد و زن کا اختلاط‘‘ کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اب ہم دوبارہ آپ کے سوالوں کی طرف آتے ہیں۔

آپ کے سوالات کسی واقعی ضرورت یا مجبوری سے متعلق نہیں ہیں، بلکہ میرا خیال ہے کہ آپ یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ (cousins) لڑکے لڑکی کے لیے اسلام میں کتنی آزادی ہے اور کتنی نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بغیر کسی حقیقی مقصد اور حقیقی ضرورت کے کوئی آزادی نہیں ہے، مثلاً وہ کلاس فیلو ہیں اور انھیں ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت ہے تو خالص اسی مدد کی نیت سے اور اسی کی حد تک وہ آپس میں بات چیت کر سکتے ہیں، گو اسلام پسند یہی کرے گا کہ اس کا کوئی اور بہتر حل نکالا جائے۔

جہاں تک دیکھنے کا تعلق ہے تو اس کی بھی کوئی ضرورت ہونی چاہیے ورنہ محض اس وجہ سے دیکھنا کہ وہ ایک لڑکی ہے، یہ جائز نہیں ہے۔

انسان کو جس سے محبت ہو جائے، اس کے بارے میں وہ اضطراراً سوچتا رہتا ہے، اگر وہ شاعر ہے تو شاعری بھی کرے گا، یہ چیزیں ناجائز نہیں ہیں، جب تک کہ ان میں برائی اور گناہ کی سوچ شامل نہ ہو۔ ویسے آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اس مصیبت سے نکالے، کیونکہ یہ اس کے کردار کے لیے برے اثرات کا باعث بن سکتا ہے۔ عشق سے نکلنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اسی یا کسی بھی لڑکی سے شادی کر لے اور اس کے بعد خدا پر توکل کرتے ہوئے حقیقت شناسی کا راستہ اختیار کرے۔

آپ کے آخری سوال کا جواب یہ ہے کہ جس لڑکی کے بارے میں آدمی کا ذہن عشق و محبت کے جذبات سے خالی ہو، اس کے بارے میں بھی صحیح رویہ یہی ہے کہ آدمی ضرورت کی حد تک ہی اس سے گفتگو کرے اور اس کے لیے اپنے اچھے سے اچھے جذبات کا بھی کسی بہتر ذریعے ہی سے اظہار کرے۔

اسلام میں عقیقہ کا حکم

سوال: عقیقہ فرض ہے یا سنت ہے؟ اور کیا بچے کی پیدایش کے بعد کچھ متعین دنوں کے اندر اندر ہی عقیقہ کرنا ضروری ہے؟ (اے ایم طارق)

جواب: عقیقے کی قربانی نفلی قربانی ہے۔ غامدی صاحب کی تحقیق کے مطابق یہ ان سنن میں سے نہیں ہے جنھیں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور شریعت اس امت میں جاری کیا ہے۔

البتہ بچوں کی پیدائش پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی قربانی کی ہے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دی ہے، چنانچہ یہ آپ کا اسوہ ہے۔

اکثر علما کی راے کے مطابق عقیقے کا دن نومولود کا ساتواں دن ہے، لیکن یہ بات بھی لازم نہیں ہے۔

کافر اور غیر مسلم میں فرق

سوال: کافر اور غیر مسلم میں کیا فرق ہے؟ (عبدالعزیز)

جواب: کافر سے مراد وہ شخص ہے جو جان بوجھ کر حق کا انکار کرتا ہے، یعنی جس کے سامنے اسلام پیش کیا گیا یا اس نے خود اسے پڑھا اور قرآن وغیرہ کا مطالعہ کیا اور اسے اس بات کی سمجھ آ گئی کہ یہ حق ہے اور اسے قبول کرنا اس کے لیے ضروری ہے، لیکن اس نے جان بوجھ کر اس حق کو جھٹلا دیا اور اسے نہیں مانا تو یہ شخص خدا کے نزدیک کافر شمار ہو گا، لیکن ہم چونکہ اس کے دل میں جھانک کر یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ اس نے جان بوجھ کر جھٹلایا ہے یا وہ معذور تھا، اس لیے ہم اسے کافر نہیں کہہ سکتے۔ جبکہ غیر مسلم سے وہ شخص مراد ہے جو مسلمان نہیں ہے۔ اس نے جان بوجھ کر کسی حق کا انکار کیا ہے یا نہیں، یہ ہم نہیں جانتے۔ چنانچہ قیامت کے دن خدا اس کا فیصلہ کرے گا۔

اجارہ اسکیم اور سود

سوال: بعض اسلامی بینکوں کی متعارف کردہ اجارہ اسکیم کے تحت لیز پر کار لینا صحیح ہے یا نہیں؟ (عفان صادق)

جواب: غامدی صاحب کے نزدیک سود پر قرض لینا ممنوع نہیں ہے، ان کے نزدیک سود دینا حرام نہیں ہے، البتہ سود لینا صریحاً حرام ہے۔ بنک کی عام اسکیم کے تحت کار کے لیے قرض لے لیں یا اجارہ اسکیم کے تحت لیز پر کار لے لیں، غامدی صاحب کے نزدیک دونوں کی اجازت ہے۔

اجارہ اسکیم کے حوالے سے اصولی بات یہ ہے کہ یہ اسکیم سود سے پاک ہے، بشرطیکہ بنک واقعۃً کرایے اور ملکیت کو الگ الگ واضح کر کے اسے اختیار کرے۔

تاہم یہ معلوم کرنا کہ فلاں بنک کی اجارہ اسکیم سود سے بالکل پاک ہے یا نہیں؟ تو اس کے لیے ضروری ہے کہ

بنک کی اس اسکیم کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے۔

نماز میں رفع یدین

سوال: نماز پڑھنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ نماز میں رفع یدین کرنا ضروری ہے یا اس کی صرف اجازت ہے، یعنی جو کرنا چاہے، وہ کر سکتا ہے؟ (تنزیل نیازی)

جواب: نماز پڑھنے کا وہی طریقہ ہے جو مسلمانوں کی مساجد میں رائج ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

جہاں تک رفع یدین کا تعلق ہے جس پر مسلک اہل حدیث کے افراد بہت زور دیتے ہیں تو بے شک وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، لیکن وہ نماز کا لازمی حصہ نہیں ہے۔ آدمی اسے اختیار کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔

مزید تفصیل کے لیے آپ غامدی صاحب کی تصنیف ''میزان'' کے باب ''قانون عبادات'' کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی

سوال: کیا اسلام میں فیملی پلاننگ کی اجازت ہے؟ اور کیا فیملی پلاننگ کے محکمے میں ملازمت کرنا جائز ہے؟ (تنزیل نیازی)

جواب: اسلام کو فیملی پلاننگ پر کوئی اعتراض نہیں سوائے اس کے کہ کسی غلط عقیدے یا کسی غلط تصور کی بنا پر ایسا کیا جائے۔ کسی بھی معقول مقصد کے لیے فیملی پلاننگ کی جا سکتی ہے۔ استقرار حمل سے پہلے پہلے فیملی پلاننگ کے لیے جو طریقہ آپ کو اپنانا ہو، وہ اپنا سکتے ہیں۔ فیملی پلاننگ کے ادارے میں ملازمت پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے، الّا یہ کہ اس ادارے میں فیملی پلاننگ کے طریقے، اصول اور اس کے مقاصد دینی تعلیم سے متصادم ہوں، اگر ایسا ہو تو پھر ملازمت کرنا درست نہیں ہوگا۔

اپنی زبان میں نماز پڑھنا

سوال: کیا مسجدوں میں نماز، نمازیوں کی اپنی زبان میں پڑھائی جاسکتی ہے؟ (دانش جمال)

جواب: نہیں، یہ درست نہیں ہے، کیونکہ نماز میں سورۂ فاتحہ اور قرآن مجید کے کچھ حصے کی تلاوت کا حکم ہے۔ یہ دونوں عربی زبان میں ہیں، لہٰذا یہ چیزیں تو عربی ہی میں پڑھنی ہوں گی، کیونکہ ترجمۂ قرآن، قرآن نہیں ہوتا۔

البتہ وہ اذکار اور دعائیں جو امام اور مقتدی اپنے اپنے طور پر پڑھتے ہیں، وہ استاذ محترم جاوید احمد صاحب غامدی کی راے کے مطابق اپنی زبان میں پڑھی جاسکتی ہیں۔

خدا ہر چیز کو محیط ہے

سوال: ایک عالم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ اپنے وجود کے ساتھ موجود نہیں، بلکہ اس کا علم ہر جگہ کا احاطہ کیے ہوئے ہے، کیا یہ بات درست ہے؟ (وجاہت علی خان)

جواب: ارشاد باری ہے:

وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطًا. (النساء ۴:۱۲۶)

''اور اللہ ہی کے لیے ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔''

خدا کا یہ احاطہ کرنا کسی بڑے مادی وجود کے چھوٹے مادی وجود کا احاطہ کرنے کی مثل نہیں ہے، بلکہ اس کا یہ احاطہ کرنا اس کے علم وقدرت کے اعتبار سے ہے اور یہی بات اس کی شان کے مطابق ہے۔

اسی طرح خدا کا موجود ہونا بھی اشیا کے موجود ہونے کی طرح نہیں ہوتا، چنانچہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا ہر جگہ موجود ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جیسے کوئی مادی وجود کسی ایک جگہ پر موجود ہوتا ہے، اسی طرح خدا (کسی ایک جگہ پر نہیں، بلکہ وہ) ہر جگہ موجود ہے۔

نہیں، یہ بات صحیح نہیں ہے، خدا اپنے علم اور اپنی قدرت ہی کے اعتبار سے ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ اور اس کی حقیقت کو ہم سمجھنے سے قاصر ہیں۔

معوذتین قرآن کا حصہ

سوال: کیا یہ بات صحیح ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود سورۂ فلق اور سورۂ ناس کو قرآن مجید کا حصہ نہیں سمجھتے تھے؟ (وجاہت علی خان)

جواب: ایک روایت میں یہ بات ہمیں اسی طرح ملتی ہے، لیکن امت نے متفقہ طور پر اس روایت کو قرآن مجید کے حوالے سے کوئی اہمیت نہیں دی۔ اگر اس بات کو اہمیت دی گئی ہوتی تو ہم اس امت میں ایسا قرآن مجید پاتے جس میں یہ دونوں سورتیں موجود نہ ہوتیں، لیکن الحمدللہ اس طرح کا کوئی قرآن اس امت میں رائج نہیں ہے۔

نبی کی تعریف میں مبالغہ

سوال: ہمارے ہاں بعض مذہبی گروہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں انتہائی مبالغہ کرتے ہیں، آپ براہ مہربانی اس کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بیان فرمائیں۔ (شیخ طیب معاویہ)

جواب: ارشاد باری ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ. (المائدہ ۵:۷۷)

”کہہ دو، اے اہل کتاب، اپنے دین میں بے جا غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی بدعات کی پیروی نہ کرو جو اس سے پہلے گمراہ ہوئے اور جنھوں نے بہتوں کو گمراہ کیا اور جو راہ راست سے بھٹک گئے۔“

نیز ارشاد باری ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ. (ص ۳۸:۲۶)

”اے داؤد، ہم نے زمین میں تجھے اقتدار دیا ہے، پس تو لوگوں کے مابین حق کے ساتھ فیصلہ کرنا اور اپنی خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمھیں اللہ کی راہ سے ہٹا دے، بے شک جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں، ان کے لیے سخت عذاب ہے، اس وجہ سے کہ انھوں نے روز حساب کو بھلائے رکھا۔“

ان دونوں آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین جیسی حق بات میں بھی اگر آدمی غلو کو اختیار کرے تو وہ راہ راست سے بھٹک جاتا ہے۔ دین میں غلو کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان دین میں اللہ کے بتائے ہوئے اعتدال اور توازن کو بگاڑ دے، مثلاً خدا نے کسی چیز کو جو مقام دیا ہو، انسان اس چیز کو اس سے بڑے مقام پر کھڑا کر دے، جیسا کہ عیسائیوں نے اللہ کے بندے اور اس کے رسول عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنا دیا یا یہود نے اپنے علما کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا یا عیسائیوں نے رہبانیت کو دین کی اعلیٰ صورت قرار دے دیا، وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں

انسان انتہائی خلاف حق بات کہتا اور سخت گمراہ ہو جاتا ہے۔اس غلو کی وجہ یقیناً یہی ہوتی کہ انسان حق کے بجاے اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے۔ چنانچہ وہ حق سے بہت دور نکل جاتا ہے۔

سورۂ ص میں بیان کردہ یہ بات بھی بالکل صحیح ہے کہ انسان خواہش نفس کی پیروی تبھی کرتا ہے جب وہ اپنے روز حساب کو بھلا دیتا ہے، کیونکہ اس کے بعد پھر حق اس کا مسئلہ نہیں رہتا۔

یہ بات درست ہے کہ ہمارے ہاں بعض گروہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں انتہائی مبالغے سے کام لیتے ہیں، ان کا یہ رویہ سراسر غلط ہے، کیونکہ اس کے نتیجے میں اللہ کا قائم کردہ توازن اور اعتدال بالکل بگڑ جاتا ہے۔

کسی بھی حقیقت کو مبالغے سے بیان کرنا، لوگوں میں بہت سی غلط فہمیوں کا باعث بنتا اور ان کے دین کو یکسر بدل کر رکھ دیتا ہے۔ ایسا نہیں کہ یہ کوئی معمولی جرم ہے، بلکہ یہ بڑا سنگین جرم ہے اور یہ یقینی بات ہے کہ اس کی پرسش بھی بہت سخت ہوگی، جیسا کہ سورۂ مائدہ کی درج ذیل آیات سے واضح ہے:

”وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِي وَاُمِّيَ اِلٰـهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰـهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِي وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ. مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِي بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ. اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ. (۵:۱۱۶-۱۱۹)

”اور یاد کرو، جبکہ اللہ پوچھے گا: اے عیسیٰ ابن مریم، کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا معبود بناؤ۔ وہ جواب دے گا: تو پاک ہے، میرے لیے کیسے روا تھا کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے یہ بات کہی ہے تو تو اسے جانتا ہے۔تو جانتا ہے جو کچھ میرے جی میں ہے، پر میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے۔غیب کی باتوں کو جاننے والا تو بس تو ہی ہے۔ میں نے تو ان سے وہی بات کہی تھی جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی۔ اور میں ان پر گواہ رہا جب تک میں ان میں موجود رہا۔ پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ہی ان پر نگران رہا اور تو تو ہر چیز پر گواہ ہے ہی۔ اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو بخش دے تو تو غالب اور حکمت والا ہے۔ اللہ فرمائے گا آج کے دن سچوں کو ان کا سچ نفع دے گا۔“

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے بڑے صریح اور واشگاف الفاظ میں ایک جلیل القدر پیغمبر سے یہ سوال کیا ہے کہ اس

کی قوم نے اس کے اور اس کی ماں کے بارے میں جو غلو اختیار کیا تھا، کیا خود اس نے انھیں اس کا حکم دیا تھا۔ معلوم ہوا کہ غلو کے اس جرم میں اگر (نعوذ باللہ) اللہ کا پیغمبر بھی شامل ہوتا تو وہ بھی خدا کے سخت عتاب سے ہرگز نہ بچ سکتا۔

چنانچہ یہ بڑی سنگین بات ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ان کے بارے میں وہ بات کہے جو خود اللہ اور اس کے رسول نے نہیں کہی، لہٰذا جو لوگ اپنی خواہش نفس کی پیروی کرتے ہوئے دین میں اس طرح کا غلو اختیار کریں گے وہ اللہ کی پرسش سے ہرگز نہ بچ سکیں گے۔

البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ کسی کی تعریف کا وہ شوخ انداز یا وہ ادبی اسلوب دین میں ممنوع نہیں ہے جس سے کوئی دینی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔

کتے کی موجودگی میں فرشتے کا گھر میں نہ آنا

سوال: غامدی صاحب نے ایک ٹی وی پروگرام میں یہ کہا ہے کہ ایسی کوئی حدیث موجود ہی نہیں جس میں یہ کہا گیا ہو کہ ''جس گھر میں کتا ہو، اس میں خدا کے فرشتے داخل نہیں ہوتے''، حالانکہ مشکوٰۃ میں اس مضمون کی درج ذیل حدیث موجود ہے:

''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویر، کتا یا جنبی شخص ہو۔''

براہ مہربانی صحیح نقطۂ نظر کی وضاحت کر دیں۔ (شکیل احمد سید)

جواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مضمون کی احادیث ہماری کتب احادیث میں پائی جاتی ہیں، جیسا کہ آپ نے بھی بیان کر دی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ کتوں کے بارے میں یہ بات تعمیم کے اسلوب میں نہیں مانی جا سکتی کہ جہاں کتے موجود ہوں، وہاں فرشتے نہیں آتے، کیونکہ قرآن مجید میں کتوں کے سدھائے جانے کا اور ان کے شکار کے جواز کا ذکر موجود ہے۔ ارشاد باری ہے:

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ. (المائدہ ۵: ۴)

”وہ تم سے سوال کرتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال ٹھیرایا گیا ہے۔ کہو، تمھارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال ٹھیرائی گئی ہیں۔ اور شکاری جانوروں میں سے جن کو تم نے سدھایا ہے، اس علم میں سے کچھ سکھا کر جو اللہ نے تمھیں سکھایا ہے تو تم ان کے اس شکار میں سے کھاؤ جو وہ تمھارے لیے روک رکھیں اور ان (شکاری جانوروں) پر اللہ کا نام لے لیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ بہت جلد حساب چکانے والا ہے۔“

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے شکاری جانوروں خواہ وہ شکاری کتے ہوں یا باز اور عقاب وغیرہ، ان کا ذکر مثبت انداز میں کیا ہے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ شکار کے مقصد سے کتے یا باز اور عقاب وغیرہ رکھنا، انھیں پالنا، انھیں سدھانا اور ان کے ذریعے سے شکار کرنا، خدا کے نزدیک نہ کوئی گناہ کا کام ہے اور نہ مکروہ کام، لہٰذا جن احادیث میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جہاں کتا موجود ہو، ان کا مطلب بہرحال، ان آیات کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ یہ بات نہیں مانی جا سکتی کہ جہاں شکار کے وہ کتے موجود ہوں جنھیں رکھنا، پالنا، سدھانا اور ان کے ذریعے سے شکار کرنا، نہ کوئی گناہ کا کام ہے اور نہ کوئی مکروہ کام، بلکہ ہمیں ان کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ جب تم انھیں شکار کے لیے چھوڑو تو ان پر اللہ کا نام لے لیا کرو، وہاں اللہ کے فرشتے نہ آتے ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کتے کی موجودگی میں فرشتے کے گھر میں داخل نہ ہونے کا معاملہ ہر عام و خاص کتے کے حوالے سے نہیں ہے۔ یعنی ان احادیث میں کتے کا لفظ تعمیم کے اسلوب میں نہیں بولا گیا کہ اس سے ہر قسم کا کتا مراد لیا جا سکے۔

اس مسئلے کو بخاری و مسلم کی درج ذیل احادیث واضح کرتی ہیں۔ ارشاد نبوی ہے:

”جو شخص مویشیوں یا کھیتی کی حفاظت کے علاوہ کتا پالتا ہے، اس کے ثواب میں سے ہر روز ایک قیراط کم کر دیا جاتا ہے۔“ (بخاری، رقم ۳۳۲۴)

”جس نے مویشیوں کی حفاظت، شکار کی غرض یا کھیتی کی حفاظت کے سوا کتا رکھا، اس کے ثواب میں سے ہر روز ایک قیراط کم ہوتا ہے۔“ (بخاری، رقم ۲۳۲۲)

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شکاری کتوں یا کھیتی اور مویشیوں کی حفاظت کرنے والے کتوں کے سوا دوسرے کتوں کو مار دینے کا حکم دیا۔“ (مسلم، رقم ۱۵۷۱)

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی حقیقی ضرورت کے لیے کتا پالنا اور رکھنا ممنوع نہیں ہے، البتہ خواہ مخواہ کتے پالنے کے شوق سے کتا رکھنا، اسلام کے نزدیک ممنوع ہے۔ اسی طرح آوارہ کتوں کو گھروں میں آنے دینا بھی درست نہیں ہو گا۔

چنانچہ جس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ''فرشتے اس گھر میں نہیں جاتے جس میں تصویر، کتا یا جنبی آدمی ہو''، اس میں ہمارے نزدیک کتے سے مراد آوارہ کتا ہے یا پھر وہ کتا جو محض کتے پالنے کے شوق سے رکھا گیا ہو۔

بنک میں ٹریننگ منیجر کی ملازمت

سوال: اس میں کوئی شک نہیں کہ بنک ایک سودی ادارہ ہے اور اس کی ملازمت صحیح نہیں ہے، لیکن اگر میں اس میں ٹریننگ منیجر یا ٹریننگ کرنے والے شخص کی حیثیت سے ملازمت کرتا ہوں تو کیا میری یہ ملازمت جائز ہو گی؟ (عاطف اعجاز)

جواب: بنک کی ملازمت کرنا دراصل، ایک سودی ادارے کو اپنی خدمات پیش کرنا ہے۔ چنانچہ انتہائی مجبوری کے سوا کسی صورت میں بھی اس کی اجازت نہیں ہو سکتی۔